نرخنامہ اُجرت اشتہار

ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ - ۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ روپیہ
آدھا صفحہ - ۵۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۸ روپیہ
چوتھائی صفحہ ۲۵ "	۱۳ "	۷ "	۴ روپیہ

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اسکی عہد بعہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے معہ انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں۔ حجم ۲۵۰ صفحات۔ قیمت عہ/ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اسکے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب معہ ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ/

تصانیف نیاز فتحپوری

ملنے کا پتہ: مینیجر

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عہ/)

علاوہ محصول۔

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲ افسانے و مقالے درج ہیں۔ زبان، قدرت بیان، تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشی مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ/)

علاوہ محصول۔

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری، اور سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں معہ تصویر حضرت نیاز ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول۔

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ/)

علاوہ محصول۔

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوجاتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا۔

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (صے) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۳۱) — فہرست مضامین مارچ ۱۹۳۷ء — شمار (۳)

ملاحظات ——— ۲

شعر اور عورت ——— جلیل الرحمان اعظمی ——— ۹

ضلع کا ڈاکٹر ——— ۱۹

ضیا بدایونی اور مومن ——— تنویر قادری ——— ۲۸

لامذہبیات ——— ۴۹

مکتوبات نیاز ——— ۵۸

باب الاستفسار ——— ۶۳

مجیرات ——— ۷۲

اختراعات ——— ۷۶

منظومات ——— قیصر، تمکین، کیفی، ماہر ——— ۷۸

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری　　　معاون:- جلیل الرحمان اعظمی

جلد (۳۱)	مارچ سنہ ۴۷ء	شمار (۳)

ملاحظات

ہمارے ملک کے نوجوان اور مغرب کی بیجا تقلید

اگر کوئی شخص مجھ سے سوال کرے کہ کیا صرف ایک لفظ میں قوموں کی ہلاکت کا راز بتایا جا سکتا ہے، تو میں کہوں گا کہ "ہاں" اور فوراً لفظ "تقلید" میری زبان سے نکل جائے گا۔

ہم اگر کسی کو "غلام" کہدیں تو وہ یقیناً برہم ہو جائے گا اور غلامی کی نسبت کبھی اپنے ساتھ گوارا نہ کرے گا، ہم اگر کسی کو "جاہل و ناکارہ" کے الفاظ سے یاد کریں تو وہ اس کو یقیناً برداشت نہ کرے گا اور اس کی پیشانی پر بل پڑ جائیں گے، اگر ہم کسی کو "مسلوب العقل یا فاتر الحواس" کہدیں تو وہ یہ سننا کبھی پسند نہ کرے گا اور ہم سے جنگ پر آمادہ ہو جائے گا۔ لیکن کسقدر حیرتناک امر ہے کہ ہماری جماعت کا بڑا حصہ اپنے آپ کو خود نہایت فخر سے "مقلّد" کہتا ہے، اور مطلق نہیں سمجھتا کہ یہ لفظ مجموعہ ہے ان تمام مفاہیم کا جو غلامی، جہل، حماقت فتورِ عقل و حواس اور اسی طرح کے بہت سے توہین آمیز الفاظ سے ظاہر کئے جا سکتے ہیں۔

لفظ "تقلید" عربی ہے جس کا مادہ "قلد" ہے، پھر اس مادہ سے بنا ہوا عربی کا کوئی لفظ آپ لے لیجئے اس میں غلامی و بیچارگی، گرفتاری و فتادگی کا مفہوم کسی نہ کسی نہج سے ضرور پایا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اتباع و پیروی بُری چیز نہیں اور نظام عالم بڑی حد تک اس پر منحصر ہے، لیکن تقلید بصارت کھو دینے کا نام نہیں ہے، تعطلِ دماغ اور عقل کو خیرباد کہدینے کے مترادف نہیں ہے، اور اگر اتباع و تقلید کا مذہبی یا اخلاقی مفہوم یہی ہے تو مذہب و اخلاق دونوں انسان کے لئے بیکار ہیں

اور اگر ہماری معیشت و معاشرت کا نظام یہی بتاتا ہے تو انسان کو متمدن کہنا یقیناً انسانیت کی توہین ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر انسان سیادت وقیادت کی اہلیت نہیں رکھتا لیکن اس کا یہ فطری حق اس سے کبھی نہیں چھینا جا سکتا کہ وہ بغیر سوچے سمجھے کسی کو اپنا رہبر و ہادی بنا لے ۔۔۔ خدا برحق، رسول برحق، معجزہ و کرامات برحق، حشر و نشر برحق، لیکن اس لئے نہیں کہ اگر میں ان سے انکار کردوں تو آپ مجھے آگ میں ڈالدیں گے یا میری گردن پر چھری پھیر دیں گے۔ حق نام صداقت کا ہے اور صداقت کا تعلق اُس احساس سے ہے جو جوارح ظاہری نہیں بلکہ دل و دماغ میں "کیفیت مطمئنہ" پیدا کردیتا ہے۔

پھر ہو سکتا ہے کہ اسوقت ایک شخص صرف اس خیال سے مرعوب ہو کر کہ "آپ" ایسا فرماتے ہیں، بے چون وچرا "آمنا وصدقنا" کہدے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر شخص ایسی ہی سادہ ذہنیت رکھنے والا پیدا ہوا ہو یا یہ کہ آپ کا یہ رعب ہمیشہ اُس پر اسی طرح مسلط رہے۔ اس لئے کوئی ایسا اجتماعی نظام جس کی بنیاد صرف تمسک، روایات و تقلید پر قایم ہو کبھی دنیا میں ترقی نہیں کر سکتا اور حقیقتاً بدنصیب ہے وہ ملک جو یہ ذہنیت رکھتا ہو۔

ہندوستان کی آبادی میں دو بڑی جماعتیں پائی جاتی ہیں۔ ہندو اور مسلمان۔ اور اس میں شک نہیں کہ جتنی قدامت پرستی ہندوؤں میں پائی جاتی ہے مسلمانوں میں نہیں ہے اور ہونا بھی نہ چاہئے، کیونکہ مذہب اسلام جن اصول پر انسان کو کاربند کرنا چاہتا ہے وہ یکسر ذہنی آزادی کے حامی ہیں اور سب سے اہم تعلیم اس کی یہی ہے کہ انسان تفکر و تدبر سے کام لے۔ چنانچہ اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اس تعلیم سے کتنا فایدہ اُٹھایا اور کتنے علوم و فنون اسی تعلیم کی بدولت دنیا میں رائج ہوئے، لیکن چونکہ ماحول کے اثر سے بالکل محفوظ رہنا مشکل ہے اس لئے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہندوستان میں آکر مسلمانوں کی یہ ذہنیت بڑی حد تک متاثر ہوئی اور ہندوؤں کی تقلیدی ذہنیت کو انھوں نے خطرناک حد تک قبول کر لیا۔ پھر اگر یہ تقلید معیشت و معاشرت سے متعلق ہوتی تو ہم اس کو بُرا سمجھنے کے بجائے مستحسن قرار دیتے کیونکہ ملک کی آب و ہوا کے لحاظ سے ہندوؤں کے اصول زندگی یقیناً بہتر ہیں، لیکن لطف یہ ہے کہ مسلمانوں نے انکی اس خصوصیت پر توجہ کی نہیں اور مذہبی واہمہ پرستیوں یا دیرینہ رسم و رواج کی بہت سی باتوں کو قبول کر لیا، یعنی انھوں نے صبح اُٹھکر باہر نکل جانا، میدان کی کھلی ہوئی ہوا میں ضروریات سے فارغ ہونا، سہ پہر کو نہاکر خود کھانا طیار کرنا، نباتاتی غذا کو ترجیح دینا، رات دن میں صرف ایکبار کھانا کھانا اور سادہ زندگی بسر کرنا، تو نہیں سیکھا، لیکن عورتوں کو مکانوں کے اندر مقید رکھنا، شادی و غم میں لغو و بیہودہ مراسم ادا کرنا، اور مذہب میں روایتی خرافات کو رائج کرکے اسے صنمیاتی رنگ میں رنگ دینا، یہ سب کچھ قبول کر لیا۔

خیر یہ تو ان لوگوں کی باتیں ہیں جن کو قدامت پرست اور مذہب پرست کہا جاتا ہے، لیکن حیرت تو یہ ہے کہ ہماری جدید نسل جو اپنے آپ کو مہذب و شایستہ، آزاد خیال و روشن دماغ کہتی ہے، اس نے بھی مغربی تعلیم اور مغربی تمدن سے وہی چیز حاصل کی جو قابل ترک تھی اور اسی خصوصیت کو ترک کردیا جو اختیار کرنے کے قابل تھی۔

مغربی اقوام کی خصوصیات میں سب سے زیادہ نمایاں چیز ان کی قوم پرستی ہے۔ وہاں کا کوئی فرد خواہ وہ کسی طبقہ سے متعلق

ہو اس جذبہ سے خالی نہیں۔ اور اس کو اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی دنیائے مذہب میں خدا کو۔ یعنی جس طرح ایک مذہبی انسان خواہ کتنا ہی گنہگار و بد اعمال کیوں نہ ہو خدا کے خیال سے منحرف نہیں ہو سکتا، اسی طرح مغربی انسان خواہ وہ کتنے ہی مذموم خصایل کیوں نہ رکھتا ہو، وطن و قوم کا نام آتے ہی ایک خاص قسم کا جوش اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے اور ملک و ملت کے لئے وہ ہر ممکن قربانی کے لئے طیار ہو جاتا ہے ۔۔ یقیناً یہ چیز سیکھنے کی تھی، یہ جذبہ پیدا کرنے کے قابل تھا، لیکن افسوس ہے کہ ہمارے قلوب اس سے بالکل خالی ہیں اور ہمارے نزدیک رشتۂ وطنیت و ملت کی کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے ۔۔ دوسری خصوصیت مغربی اقوام کی انکے عزم و ارادہ کی پختگی ہے۔ وہ اپنا ایک نصب العین متعین کر لیتے ہیں اور اس کو حاصل کر کے رہتے ہیں، ایک منزل مقرر کر لیتے ہیں اور وہاں پہونچکر رہتے ہیں، کوئی مانع، کوئی حجاب، کوئی خلیج، کوئی پہاڑ ان کو اقدام سے نہیں روک سکتا اور جو قدم ایکبار اُٹھ جاتا ہے وہ پھر پیچھے نہیں پڑ سکتا۔ بڑھتے ہیں اور جانیں دیتے ہیں، جانیں دیتے ہیں اور بڑھتے ہیں یہاں تک کہ وہ منزل مقصود کو پالیں۔ قطب شمالی و قطب جنوبی تک پہونچنے میں کتنے افراد ہلاک ہوئے، لیکن سعی و اقدام کا وہی سلسلہ برابر جاری ہے، ہوائی جہازوں کی تباہیاں اکثر سننے میں آتی ہیں، لیکن اس سے دست کش ہونے کے بجائے برابر اسکی تکمیل میں مصروف ہیں، الغرض مغربی اقوام کی یہی وہ خصوصیت ہے جس نے انھیں آج اس بلند مرتبہ پر پہونچا دیا، لیکن ہم نے اس میں ان کا اتباع نہیں کیا۔ تیسری قابل ذکر خصوصیت ان کی یہ ہے کہ وہ اسوقت تک کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتے جب تک خود ان کی سمجھ میں نہ آجائے، وہ ہر چیز کی حقیقت تک پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب کسی بات کا واقعی علم انھیں حاصل ہو جاتا ہے تو وہ پھر اس پر کبھی دوسری چیز کی بنیاد رکھ کر اور آگے بڑھتے ہیں، یہاں تک کہ ایک سلسلہ اکتشافات و اختراعات کا پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ سائنس کے عجائب و غرائب کیمیا کے محیر العقول کارنامے، فلکیات کے اہم اکتشافات اور سیکڑوں جدید علوم و فنون کا ظہور سب اسی ذوق کا نتیجہ ہے، لیکن اسکی پیروی کا کوئی جذبہ ہمارے اندر موجزن نہیں ہوتا۔ ایک اور خصوصیت ان کی تنظیم زندگی اور وقت کو بیکار نہ جانے دینا ہے، جو وقت جس کام کے لئے مقرر ہے اسی وقت ہوگا اور جو تقسیم اوقات متعین ہوگئی ہے اسکی پوری پابندی ہوگی، ممکن نہیں کہ ان کی زندگی کا ایک لمحہ بھی اس سوچ میں گزرے کہ اب انھیں کیا کرنا ہے اگر سیر و تفریح ہے تو اسکے لئے بھی وقت مقرر ہے اور عیاشی و لہو لعب ہے تو اسکے بھی حدود متعین ہیں، مگر ہم نے اس باب میں بھی ان کی تقلید نہیں کی ۔۔ تقلید کی تو کس چیز میں ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لئے زیادہ جستجو کی ضرورت نہیں، آجکل کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں، کالج کے طلبہ اور پروفیسروں کی زندگی کا مطالعہ کیجئے آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ ان کی مغربیت کا معیار کیا ہے؟ ۔۔ اگر اس کا تعلق صرف ملبوس سے ہوتا تو بھی چنداں مضایقہ نہ تھا، تہذیب، معیشت و معاشرت تک محدود ہوتا تو بھی گوارا تھا، لیکن قیامت تو یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں نے سب سے زیادہ انہماک کے ساتھ مغرب کی جس ادا کو اختیار کیا وہ وہی ہے جو خود یوروپ کے معیار انسانیت کو بھی گراتی چلی جا رہی ہے۔ یعنی شراب خواری اور تماکو نوشی ۔۔ آپ اسکول کے لڑکوں سے لیکر کالج کے طلبہ و پروفیسروں تک جس کو دیکھئے اس مرض میں مبتلا ہے اور ہر وہ لڑکا جو صبح کو آئینے کے سامنے بیٹھکر اپنے بالوں کو سنوار سکتا ہے یہ بھی اپنا فرض سمجھتا ہے کہ جب وہ باہر نکلے تو اسکے منھ میں سگریٹ ضرور ہو، اسی طرح ہر وہ نوجوان جو سوسائٹی میں کوئی جگہ حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے لازم

ہے کہ وہ شراب پینا ضرور سیکھے۔ اب سے کچھ زمانہ قبل ہندوستان کے شریف گھرانوں میں ان دونوں کا رواج بہت کم تھا، شراب تو خیر بڑی چیز ہے، اپنے بزرگوں کے سامنے حقہ یا سیگریٹ پینا بھی نہایت مذموم خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن اب علی الاعلان بغیر اس خیال کے کہ کوئی بزرگ موجود ہے یا نہیں، سیگرٹ کا استعمال جاری ہے اور بھرے مجمعوں میں وھسکی وبرانڈی کا دور آزادی سے چلتا نظر آتا ہے۔

بعض تعلیم یافتہ حضرات سے میں نے دریافت کیا کہ کیا وہ ان دونوں کے مضرت رساں اثرات سے آگاہ نہیں ہیں، لیکن اسکا جواب انھوں نے نہایت بے پرواہی سے یہ دیا کہ اگر یہ چیزیں نقصان رساں ہوتیں تو یورپ وامریکہ کب کے تباہ ہو چکے ہوتے۔ میں یہ سنکر حیران ہو گیا نہ صرف اس لئے کہ ان کا احساس ہی اس باب میں بالکل فنا ہو چکا تھا بلکہ زیادہ تر اس بنا پر کہ باوجود جدید تعلیم یافتہ اور تمدن حاضر سے واقف الحال ہونے کے وہ حقیقت سے اس درجہ بیخبر تھے اور وہ مطلق آگاہ نہ تھے کہ خود مغرب کا معیارِ صحت و توانائی انھیں دو مذموم عادتوں کی وجہ سے گزشتہ نصف صدی کے اندر کتنا گرتا چلا جارہا ہے۔ — امریکہ نے جس وقت گزشتہ جنگ میں شرکت کا ارادہ کیا اور فوجی بھرتی شروع کی تو امتحان سے یہ معلوم ہوا کہ چھ نوجوانوں میں صرف ایک اس قابل تھا کہ اس سے فوجی خدمت لیجائے اور بحری فوج کے لئے تو چھ میں ایک بھی اس قابل نہ نکلا۔ — یکم جولائی ۴۱ء سے ۳۰ مئی ۴۵ء تک ۶۵۵۹۵۱ اجوانوں نے فوجی ملازمت کے لئے درخواست پیش کی لیکن ان میں ۱۲۲۶۱۵ امتحان ومعاینہ میں ناکام رہے اور صرف ۴۱۳۶۲ اس قابل سمجھے گئے کہ انھیں فوج میں بھرتی کیا جائے، حالانکہ ناکام لوگوں میں بظاہر کوئی نقص نہ پایا جاتا تھا۔

اس کے بعد جب ۲۰ ہزار سپاہیوں کی اور ضرورت ہوئی تو ۴۰ ہزار درخواستیں موصول ہوئیں لیکن ان میں صرف ۹ ہزار کامیاب ہو سکے اور بحری فوج کے معیار صحت کے لحاظ سے تو یہ اوسط بھی نہ رہا اور ۶۰۰۰ نوجوانوں میں صرف ۳۰ کا انتخاب عمل میں آسکا۔

اس فوجی افسر نے جو بھرتی کے کام پر مامور تھا نہایت افسوس کے ساتھ اپنا بیان شائع کرایا اور اپنے ملک کے نوجوانوں کے معیارِ صحت پر اظہار حیرت کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ "امسال ۱۲۰۱۱ درخواست دینے والوں میں صرف ۳۱۶ اس قابل نکلے کہ انھیں فوجی ملازمت مل سکتی"۔ امریکہ کے امیر البحر نے اپنی تقریر میں ظاہر کیا کہ "ہمارے ملک کے نوجوانوں میں جو غیر معمولی انحطاط پیدا ہوتا جارہا ہے وہ قوم کے لئے حد درجہ خطرناک ہے"۔ اسی طرح وہاں کی بیمہ کمپنیاں اور محکمہ حفظان صحت کے افسران حیران ہیں کہ یہ قبل از وقت ملک کے نوجوانوں میں انحطاط صحت کیوں ہے۔ ان کے اعصاب کیوں کمزور ہوتے جاتے ہیں، ان کے دماغوں میں غیر معمولی ضعف کیوں پیدا ہو رہا ہے، ان میں ولولۂ عمل کیوں مفقود ہو رہا ہے — چنانچہ اس کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کے صرف دو سبب ہیں ایک شراب خواری اور دوسرا تماکو نوشی — جنگ سے قبل انگلستان کے رنگروٹوں کے متعلق جنرل ٹیلٹن نے جو بیان شائع کیا تھا اس میں بھی یہی ظاہر کیا کہ "یہ اپنی صحت جسمانی کے لحاظ سے حد درجہ خام اور فراست کے لحاظ سے نہایت پست ہیں"۔ افواج برطانیہ کے سرجن جنرل نے بھی اپنی سالانہ رپورٹ میں اس انحطاط کا ذکر کرتے ہوئے ظاہر کیا تھا کہ قوم کا مستقبل صرف ہمارے ملک کے نوجوانوں پر منحصر ہے اور ان کا معیارِ صحت و توانائی روز بروز گرتا جارہا ہے اسلئے اگر تماکو نوشی کی عادت ان سے ترک نہ کرائی گئی تو کوئی امید ہمارے زندہ رہنے کی باقی نہیں ہے"۔

چنانچہ گوٹر بیون میں لندن کا برقی پیام شایع ہوا تھا کہ "سیگرٹ کا استعمال افواج برطانیہ کو تباہ و برباد کرتا چلا جا رہا ہے، اور اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا تو حکومت کی حفاظت گویا ان لوگوں کے سپرد کر دی جائے گی، جن کے اعصاب ضعیف، دماغ کمزور، اور ہمتیں مضمحل ہیں۔ مہینوں کی تعلیم و تربیت کے بعد بھی ہمارے رنگروٹ معمولی نقل و حرکت باقاعدگی کے ساتھ انجام نہیں دے سکتے اور ان کا تنہا ذوق صرف یہ رہگیا ہے کہ ایک جگہ آرام سے پڑے رہیں اور ان سے کوئی کام نہ لیا جائے"۔ سر برامپٹن نے ایکبار دوران تقریر میں ظاہر کیا کہ "ملک کے نوجوانوں میں سیگرٹ کے استعمال نے ایک گھن لگا دیا ہے کہ اگر دس بارہ سال کے بعد ہمیں جنگ کرنے کی ضرورت پیش آئی تو ہم کو ہزار میں ایک نوجوان بھی ملک کی حفاظت کا اہل نظر نہ آئے گا"۔ چند سال ہوئے امریکہ کی بحری اکاڈیمی نے انسداد تماکو نوشی کے سوال کو اُٹھایا تھا اور اس سلسلہ میں جو تحقیقات کی گئی اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو تماکو کا استعمال نہیں کرتے تھے، جسمانی و دماغی کاموں میں تماکو کا استعمال کرنے والوں سے بدرجہا فایق ثابت ہوئے۔ مزید تصدیق کے لئے بعض نوجوانوں سے یہ جبریہ عادت ترک کرائی گئی تو چند دن کے اندر ہی ان کی صحت و توانائی اور دماغی بیداری میں نمایاں فرق محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ قانون جاری کر دیا گیا کہ بحری افواج کے سپاہی تماکو کا استعمال نہیں کر سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دردِ سر، سوء ہضم وغیرہ کی شکایتیں نصف سے بھی کم رہگئیں، لیکن دو سال بعد یہ قانون منسوخ کر دیا گیا اور پھر سپاہیوں کی وہی حالت ہو گئی۔

ڈاکٹر لارنڈ نے اپنی رپورٹ میں ظاہر کیا ہے کہ "طلبہ کی صحت اور دماغی اہلیت پر تماکو نوشی کا نہایت خراب اثر پڑ رہا ہے اور سخت ضرورت ہے کہ جبراً اسے ترک کرایا جائے"۔۔۔ لیکن اسوقت تک مغرب اس باب میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکا اور آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ صرف ایک امریکہ میں جہاں چند سال قبل سالانہ ۱۸ ارب (۱۸،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰) سیگرٹ کا صرف تھا وہاں اب ایک کھرب سترہ ارب (۱۱۷،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰) کا صرف ہے۔ کثرت تماکو نوشی کے ساتھ ساتھ اسکی نوعیت میں بھی حد درجہ خطرناک تغیر پیدا ہوتا جا رہا ہے، یعنی پہلے تو صرف یہ صورت تھی کہ منھ کے اندر دُھواں لیکر اسے باہر پھینک دیا جاتا تھا لیکن اب تماکو کے دُھوئیں کو نگل کر سینے کے اندر پہونچایا جاتا ہے اور دیر تک اندر رکھنے کے بعد باہر پھینکا جاتا ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ پہلے اگر تماکو کا زہر صرف ایک مربع فٹ حصہ کو متاثر کرتا تھا تو اب ۰۰ مربع فٹ حصہ جسم کو زہر آلود بناتا ہے۔۔۔ یہ ہے نتیجہ صرف تماکو نوشی کا اور اگر اسی میں میخواری کے نقصانات کا بھی اضافہ کر دیا جائے تو پھر اس کا اظہار اعداد و شمار کے حدود سے باہر ہو جاتا ہے۔۔۔ اسوقت تماکو اور شراب کی تجارت میں جتنا سرمایہ لگا ہوا ہے اور جسقدر ان کے اشتہاروں پر صرف کیا جاتا ہے، اگر اس کا دسواں حصہ بھی خالص تعلیم و اقتصادی اصلاح پر صرف کیا جائے تو دنیا کا کوئی متنفس جاہل و مفلس نہیں رہسکتا اور ممکن ہے اس سے آپ کو کچھ اندازہ ہو سکے کہ یہ دونوں مذموم عادتیں نوع انسانی کو کتنا شدید نقصان پہونچا رہی ہیں۔۔۔ ہر چند یہ ظاہر ہے کہ جب یورپ و امریکہ کے مفکرین و مقننین اس کا انسداد نہیں کر سکے تو ہندوستان کی حکومت سے یہ توقع کرنا کہ وہ اس طرف کوئی عملی قدم اُٹھائے گی کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن انفرادی طور پر ہر ہر شخص اور اجتماعی حیثیت سے ہر ہر خاندان کا بزرگ اور ہر اسکول و کالج کے ہیڈ ماسٹر و پرنسپل کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ کرے اور ایک باضابطہ ادارہ ہر گھر اور ہر تربیت گاہ میں قایم کر کے ان دونوں کے مہلک اثرات سے

بچوں کو آگاہ کیا جائے ۔۔ ہندوستان میں متعدد انجمنیں قایم ہیں جو انسداد مسکرات کی خدمت انجام دے رہی ہیں لیکن افسوس ہے کہ اسکا نتیجہ کوئی برآمد نہ ہوا، حکومت کی آمدنی مسکرات کی بھی بڑھ رہی ہے اور سیگرٹ کے بھی نئے نئے کارخانے قایم ہوتے جا رہے ہیں۔

کالجوں اور مدرسوں میں ہم کو وہاں کے اساتذہ کی طرف سے یہ توقع قایم کرنا چاہئے کہ وہ طلبہ کو تماکو نوشی سے باز رکھیں لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب پہلے وہ خود اس کو ترک کریں اور اس کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے ۔ اسی طرح ہمیں اپنے قایدین مذہب و اخلاق سے یہ امید رکھنا چاہئے کہ وہ وعظ و پند سے کام لیکر اپنے حلقۂ ادارت میں اس مذموم عادت کے اثرات لوگوں کے ذہن نشین کرائیں، لیکن یہ کیونکر ممکن ہے جب تک وہ خود اس پر عامل نہ ہوں اور "خلوت" کے اس "کارِ دیگر" سے ان کا باز رہنا بالکل محال ہے ۔

آصفجاہ سابع کی سلور جوبلی

۱۰ ر فروری کو لکھنؤ سے روانہ ہو کر ۱۲ ر فروری کی صبح کو میں حیدر آباد پہونچا ۔ اس وقت میرے یہاں آنے کی غرض صرف یہ تھی کہ جوبلی کی تقریبات میں شریک ہو کر اعلحضرت کے اُن ارشادات عالیہ کے نتائج کا مطالعہ کروں جو تفریحات جشن کو ایک مفید لائحۂ عمل میں تبدیل کرنے کا اعلان اب سے بہت قبل کر چکے تھے اور جس کا ذکر اس سے قبل نگار میں ہو چکا ہے ۔۔ جوبلی ۔ ایک ایسی عظیم المرتبت ہستی کی ۲۵ سالہ جوبلی جو ایک طرف عہد مغلیہ کی سطوت و شوکت کی تنہا یادگار ہے اور دوسری طرف ہندوستان کی ۶۰۰ ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست کی مالک و مختار ۔ ظاہر ہے کہ اس تقریب میں جتنا ہنگامۂ مسرت و تفریح بپا کیا جاتا درست تھا، نمود و نمایش میں جتنا مبالغہ بھی کیا جاتا وہ کم تھا ۔۔ دولت کی کمی نہیں، ولولوں میں پستی نہیں، خزانۂ شاہی مالا مال، رعایا مسرور و خوشحال! اس سے زیادہ کھُل کھیلنے کے لئے اور کیا چاہئے تھا، لیکن دنیا سنکر حیرت کریگی کہ باایں ہمہ جذباتِ مسرت و شادمانی میں نے کوئی ایک تقریب بھی ایسی نہیں دیکھی جسمیں متانت و سنجیدگی سے ہٹ کر کسی رسم کو ادا کیا گیا ہو، کوئی ایک مظاہرۂ لطف و نشاط بھی ایسا نگاہ سے نہیں گزرا جسکی بنیاد لہو و لعب پر قایم ہو ۔

اعلحضرت کی وہ فطری سادگی و سادہ روی جو اپنے اندر ایک کوہ وقار عظمت پوشیدہ رکھتی ہے، ہر جگہ اور ہر موقعہ پر چھائی ہوئی تھی اور یہ تمام تقریبات باوجود انتہائی جوش کے ایسی محسوس ہوتی تھیں گویا ایک عمان بسیط کی موجیں ہیں جو چاند کے پرتو سے جگمگا تو رہی ہیں لیکن ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر شور و ہنگامہ بپا کرنا بھول گئی ہیں ۔۔۔ مراسم جوبلی کا آغاز ۱۳ ر فروری کو ہوا اور وہ اس طرح کہ بندگان عالی نے بوقت چاشت دو رکعت نماز شکرانہ باغ عامہ میں ادا کی ۔ اس کے بعد فتح میدان میں افواج باقاعدہ کی پریڈ ملاحظہ فرمائی جو تمام تقریبات میں انتہائی پرشکوہ و جلال منظر تھا ۔ شہ نشین پر اعلحضرت تمام معزز مہمانوں کے ساتھ جلوہ افروز تھے اور میدان کے چاروں طرف ہجوم کا یہ عالم تھا کہ تل رکھنے کی جگہ باقی نہ تھی ۔ بینڈ بج رہا تھا، ہز ہائنس پرنس آف برار کی کمان میں سوار و پیادہ دستے کے دستے یکے بعد دیگرے نگاہ ہمایوں کے سامنے سے گزر رہے تھے، اور اس ایک لاکھ سے زاید تماشائیوں کے ہجوم پر سکوت و سکون کا وہ عالم طاری تھا جسے "نظارہ ز جنبیدن مژہ گلہ دارد" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔۔۔ اسی دن رات کو ۹ بجے باغ عامہ کے جوبلی ہال میں (جو تین لاکھ کے صرف سے اسی غرض کے لئے طیار کیا گیا ہے) اعلحضرت کے حضور میں دکن کی رعایا کی طرف سے ایک سپاسنامہ (ایڈریس) پیش کیا گیا اور میں سمجھتا ہوں کہ تنہا یہی ایک تقریب ایسی تھی جسے تمام جشن جوبلی کا ماحصل سمجھنا چاہئے ۔

یہ ایڈریس جس کے پڑھنے اور پیش کرنے کی عزت سر صدر اعظم بہادر کو حاصل ہوئی، ایک مفصل تبصرہ تھا، آصف جاہ سابع کے گزشتہ ۲۵ سال کی حکومت پر اور جس نے اس کو سنا ہے یا اخباروں میں پڑھا ہے وہ یقیناً میری ہی طرح یہ معلوم کرکے حیران رہگیا ہوگا کہ گزشتہ ربع صدی میں سلطنت آصفیہ نے جتنی ترقی کی ہے اس کی نظیر دنیا کی کوئی حکومت پیش نہیں کر سکتی۔ قانون و عدالت، زراعت و فلاحت، تعلیم و حفظان صحت، اقتصاد و سیاست، الغرض کوئی شعبہ ایسا نہیں، جس نے موجودہ فرمانروائے دکن کے عہد میں غیر معمولی ترقی نہ کی ہو اور آیندہ کے لئے وسیع تر ترقیوں کا لائحۂ عمل اپنے سامنے نہ رکھا ہو۔

اس ایڈریس کا جواب اعلحضرت نے جن الفاظ اور جس لب و لہجہ میں دیا، وہ دنیائے حکومت کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہنے والی چیز ہے۔ اعلحضرت نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا ماحصل یہ تھا کہ نہ صرف ان کی حکومت بلکہ ان کی ذاتی و انفرادی مساعی کا نصب العین بھی ہمیشہ خلق خدا کی ہمدردی رہا ہے اور انھوں نے اس ساعت کو جو اس فکر سے غافل گزرگئی ہے کبھی اپنی حیات کا جزو قرار نہیں دیا۔۔۔۔ ممکن ہے بعض حضرات ان الفاظ کو محض رسمی و کاغذی چیز قرار دیں، لیکن وہ لوگ جنھیں اخلاق ہمایونی اور قلمرو دکن کے حالات مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا ہے، سمجھ سکتے ہیں کہ اعلحضرت نے جو کچھ فرمایا وہ حقیقتاً، حقیقت سے بہت کم ہے اور ان برکات کی تفصیل کے لئے جو صرف اعلحضرت کے بلند و پاکیزہ اخلاق کا نتیجہ کہے جاسکتے ہیں، دفتر کے دفتر ناکافی ہیں۔

۱۴ کی شام کو ہز ہائنس پرنس آف برار نواب اعظم جاہ بہادر نے افواج باقاعدہ کی طرف سے ایڈریس پیش کیا اور ۱۵ کی شب میں نہایت وسیع پیمانہ پر جوبلی ہال میں شاہانہ ضیافت کا انتظام کیا گیا۔ ۱۵ کی شب میں مغربی طرز کی دعوت کی گئی اور اسی طرح مختلف رسمی تقریبات ۲۲ فروری تک جاری رہیں گی جبکہ غالباً میں یہاں نہ ہوں گا، لیکن اسوقت تک جو کچھ جس انداز سے ہوا ہے وہ یہ سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ اعلحضرت کا مقصد اپنی ۲۵ سالہ جوبلی سے صرف یہ ہے کہ اپنی رعایا اور عمال حکومت کے سامنے دوسری ربع صدی کے لئے کوئی نیا پروگرام پیش کریں اور گزشتہ ترقیوں کی بنیاد پر زیادہ وسیع و مستحکم ذرایع ترقی قایم کرکے ملک اور اہل ملک میں تازہ روح پھونکدیں۔ اور یہی وہ مقصد عظیم تھا جس کو سامنے رکھکر بندگان عالی نے رقص و سرود، لہو و لعب، چراغاں و آتشبازی وغیرہ کے مسرفانہ مراسم کو بند کرکے ایک فرمان جاری فرمایا کہ جوبلی کی فراہم شدہ رقم میں سے اکثر حصہ رفاہ عام کے کاموں میں صرف کیا جائے اور اس سلسلہ میں سب سے پہلے امراض شُشُش کے اسپتال کا قیام ہے۔

جشن جوبلی ہمیشہ بادشاہ کی ذاتی مسرتوں کو پیش نظر رکھ منائی جاتی ہے اور اسی سے اس میں عنصر غالب لہو و لعب اور تفریح و نشاط کا ہوا کرتا ہے، لیکن چونکہ آصف جاہ سابع کی ذاتی مسرتیں ہمیشہ انھیں کاموں سے وابستہ رہی ہیں جن کا تعلق مفاد عامہ سے ہے اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ اس مقصد کے علاوہ کوئی اور مقصد بندگان عالی کے سامنے ہوتا اور ملک کا روپیہ وہ ایسے کاموں میں صرف ہونے دیتے جو اہل ملک کے کام نہ آتا ۔۔۔۔ الغرض ان آنکھوں نے یہاں وہ کچھ دیکھا جس کا تصور بھی ذہن میں نہ آسکتا تھا اور حقیقتاً خوش نصیب ہے وہ ملک جس کا فرمانروا اتنے بلند اخلاق رکھتا ہو۔

شعر اور عورت

(عرب)

سرزمین عرب ہزارہا برس سے موجود ہے، اُس کا تمدن بھی کچھ نوعمر نہیں تاہم تعجب ہے کہ آج سے صدیوں قبل جبکہ اُن کے چمنستان تمدن میں غریب عورت کی آبیاری کو کچھ دخل نہ تھا اور نہ اُن کی تعلیمی و اخلاقی ارتقاء کے لئے کوئی باقاعدہ نظام مقرر تھا، اُسوقت بھی کم ازکم شعر و شاعری میں جو درحقیقت ایک فطری فن ہے ایسی ایسی قابل عورتیں گزری ہیں جن کے کارنامے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

شاعری کا احساسات وجذبات سے دراصل چولی دامن کا تعلق ہے خود شاعر کے لفظی معنے صاحب شعور کے ہیں، اور شعور اصل میں احساس کو کہتے ہیں۔ یعنی شاعر وہ شخص ہوتا ہے جس کا احساس قوی ہو اس اعتبار سے عورت مجسمۂ شاعری ہے، اس لئے کہ اُس کے احساسات وجذبات فطرۃً نہایت نازک، لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں، ہمارا روز کا تجربہ ہے کہ کسی شخص کی مصیبت کا حال اگر درد انگیز لفظوں میں بیان کیا جائے تو اُس کا اثر جس قدر صنف نازک پر ہوتا ہے مردوں پر نہیں ہوتا۔ دوست کی مفارقت، اولاد کی جدائی، گھر بار کی بربادی، ملک ومال کی تباہی ہر شخص پر اثر کرتی ہے لیکن ایک عورت اس موقع پر وفور غم سے بالکل پاگل ہوجاتی ہے، دریا کی روانی سبزہ کی لہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، صبح کی شگفتگی اور شام کی دل آویزی ایسے مناظر ہیں جن سے ہر شخص لطف اندوز ہوتا ہے لیکن یہی چیزیں ایک عورت پر وجد کی کیفیت طاری کردیتی ہیں جس سے وہ سرشار ہوکر جھوم اُٹھتی ہے، یہ بہت ممکن ہے کہ وہ کسی وجہ سے اپنے احساسات کو الفاظ کا جامہ نہ پہنا سکے، لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ تاثر وانفعال میں وہ مردوں سے کہیں زیادہ ہے اور یہی چیز شعری کائنات اور شاعری کی حقیقی بنیاد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عورتوں نے شعر و شاعری میں بارہا مردوں سے مقابلہ کیا اور کبھی اُن سے پیچھے نہیں رہیں بلکہ اس میدان میں شاید ہی کوئی ایسا انعام ہو جو انھوں نے حاصل نہ کیا ہو، عربوں کے بڑے زبان آور شعرا میں خنساء کا نام ایک امتیازی خصوصیت رکھتا ہے جو ایک عورت تھی، اسی طرح لیلیٰ الاخیلیہ ایک بڑی نامور

شاعرہ گزری ہے جو اپنے زمانہ کے بڑے بڑے شعراء سے بار بار بازی لے گئی۔

یوں تو دنیا کا کوئی ایسا طبقہ نہیں جہاں ہر زمانہ اور ہر دور میں کوئی نہ کوئی شاعرہ نہ پیدا ہوئی ہو مگر سرزمینِ عرب کو اس میں غیر معمولی خصوصیت حاصل تھی۔ شعر گوئی اور انشا پردازی اہلِ عرب کے خمیر میں داخل تھی، قدرت نے جذبات کے اظہار پر اُن کو ایسی قدرت عطا فرمائی تھی کہ اُس زمانہ کی بڑی بڑی مہذب قومیں بھی اُن کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکتی تھیں، وہاں کے مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب ہومر اور شکسپیر کی شان رکھتے تھے۔

حربِ بسوس میں امامہ بنت کلیب کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ جب اُس کے باپ کلیب کو جساس اور عمرو بن حارث نے دھوکہ سے قتل کر دیا تو وہ روتی پیٹتی اپنے چچا مہلہل کے پاس پہونچی، دیکھا تو وہ شراب کے نشہ میں مدہوش اور عیش و نشاط میں سرشار ہے اُس کو سخت غصہ آیا، مہلہل کو لعنت و ملامت کرتے ہوئے اُس وقت اُس نے جو فی البدیہہ اشعار کہے تھے اُن میں سے چند درج ذیل ہیں، جن سے عربوں کے فطری شاعرانہ ذوق کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

۱	أتلهو بالملاهي والخمور ولا تدري بعاقبة الامور۔	کیا تم لہو لعب اور شراب و کباب ہی میں مشغول رہو گے اور انجام کی کچھ خبر نہ ہو گی۔
۲	ولا تدري بانّ كليباً اضحى قتيلاً عند جساس الغدور۔	کیا تمھیں معلوم نہیں کہ کلیب کو غدار جساس نے قتل کر دیا ہے۔
۳	فواعجبا لجساس وعمرو لقد جسرا على امرٍ نكير۔	جساس اور عمرو پر تعجب ہے کہ انھوں نے ایسے فعل قبیح پر جرأت کی۔
۴	ويا ويلا لجساس وعمرو لقد رميا اخاك بعنقفير۔	افسوس ہے جساس اور عمرو پر کہ انھوں نے تمہارے بھائی کو انتہائی فریب سے قتل کر ڈالا۔
۵	فبادروا انزعن الرمح منه فما احدٌ علينا بالجسور۔	پس جلدی پہونچو اور اسکے جسم سے نیزہ نکالو۔ کیا (اس سے قبل بھی) ہمارے مقابلہ میں کسی کو سرکشی کی جرأت ہو سکی ہے۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب) جلد اول ص

عمرۃ خثعمیہ ایک بڑھیا ہے، اہل و عیال سب ختم ہو چکے ہیں۔ صرف دو بچے ہیں جو اسکی زندگی کا آخری سہارا ہیں جب وہ اُنکی جوان مرگی کی خبر سنتی ہے تو فرطِ غم سے پاگل ہو جاتی ہے اور درد میں ڈوبا ہوا مرثیہ کہتی ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

۱	ابى الناس الا ان يقولوا هما هما ولو اننا اسطعنا لكان سواهما	لوگ اصرار سے کہتے ہیں کہ وہی (میرے دونوں بچے) امر ہیں اور اگر ہمارا بس ہوتا تو ہم کہتے کہ اُنکا نہیں بلکہ کسی اور کا انتقال ہوا ہے

۲ — ثُبنیاعجوزٍ حرم الدھر اھلھا	ہائے وہ بڑھیا جس کے شوہر کو زمانہ پہلے ہی مٹا چکا تھا۔
فلیس لہا الا الالہ سوا ہما۔	یہی دو بچے (خدا کے علاوہ) اُس کے سرمایۂ حیات تھے۔
۳ — ہما اخوا فی الحرب من لااخالہ	یہ دونوں معرکہ جنگ میں اُس شخص کے مددگار ہوتے تھے جسکا کوئی نہیں ہوتا تھا۔
اذا خاف یوماً نبوۃً فدعا ہما۔	جب زمانہ کی نامساعدت کا کسی کو ڈر ہوتا تھا تو وہ ان دونوں کو بلاتا تھا۔
۴ — ہما یلبسان المجد احسن لبسۃٍ	وہ دونوں عزت و مجد کے لباس فاخرہ سے مزین تھے
شحیحان ما استطاعا علیہ کلاھما۔	اور حتی الامکان اُس کے حصول میں کوشاں رہتے تھے۔
۵ — شہابان منا اوقد اثم اخمدا	ہائے وہ دونوں ہمارے چمکتے ہوئے ستارے تھے جو پہلے روشن ہوئے اور پھر بجھا دیئے گئے
وکان سنناً للمجدلین ضیا ھما۔	ان دونوں کی آگ مہمانوں کے لئے ہمیشہ روشن رہتی تھی۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول صفحہ ۱۴۶)

جس ملک کے بچوں، بوڑھوں کی سحر بیانی کی یہ کیفیت ہو تو پھر قیاس کیجے کہ وہاں جوان عورتوں کے جذبات و احساسات کا کیا عالم ہوگا؟

جزیرہ عرب کے اُن خانہ بدوش قبائل میں جو اپنے لطیف تاثرات اور عاشقانہ جذبات کے لحاظ سے بہت مشہور تھے۔ ایک ممتاز قبیلہ بنو عذرہ کا بھی تھا، جس کے حسن و عشق کے افسانوں نے اس درجہ شہرت حاصل کرلی تھی کہ عرب میں حبًّا عذریًّا کا ایک لطیف محاورہ پیدا ہوگیا تھا جو آج تک ضرب المثل ہے۔ اسی مقدس سرزمین کے دو جانباز عاشق و معشوق زرعہ اور ظریفہ بھی تھے، ظریفہ نہ صرف اپنے حسن و جمال بلکہ ذوق شاعری کے لحاظ سے بھی نمایاں امتیاز رکھتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ قبیلہ کے تالاب پر ٹہل رہی تھی کہ اتنے میں زرعہ بن خالد شکار کھیلتا ہوا اُدھر آنکلا، دیکھا تو سامنے ظریفہ تھی، نگاہیں چار ہوتے ہی دل ہاتھ سے کھو بیٹھا، سر چکرایا اور بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑا۔

ظریفہ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اُٹھی اور اُس کے پاس گئی، ہوش میں لانے کی بہت سی تدبیریں کیں لیکن جب کسی طرح ہوش نہ آیا تو تالاب سے پانی لائی اور محبت بھرے ہاتھوں سے پانی کے چھینٹے دینے لگی۔ چند منٹ میں مریض عشق نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو دلدار کا چاند سا مکھڑا سامنے تھا آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا اور کہنے لگا۔ ہل مقتولٌ یداً دیہ قاتلہ، (کیا دنیا میں ایسے خوش نصیب بسمل بھی ہوا کرتے ہیں جنکا علاج کرنے والا بھی وہی ہو جس نے ذبح کیا ہے)

ظریفہ بھی دل پر چوٹ کھا چکی تھی، مسکرا کر بولی پھر آپ کو شکایت کیا ہے؟

اب کیا تھا پیمان محبت اُستوار ہوا، زرعہ نے عشق و محبت کی شراب ناب سے مخمور ہو کر یہ اشعار …

پڑھنا شروع کئے۔

۱ — خرجتُ اصید الوحش صادفت قانصًا
من الریم صادتنی سریعًا حبائلہ۔

۲ — فلما رمانی بالنبال مصارعًا
رقانی وہل میتٌ یداویہ قاتلہ۔

۳ — الا فی سبیل الحب صبٌّ قد انقضی
سریعًا ولم یبلغ مرادًا یحاولہ۔

میں تو اس ارادے سے نکلا تھا کہ صحرائی جانوروں کا شکار کھیلوں گا،
لیکن وہاں ایک سفید رنگ غزالہ نے خود مجھی کو شکار کر لیا۔
پھر جب وہ تیر مار کر مجھے بے بس کر چکی تو خود ہی فکر درماں بھی کرنے لگی
کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ مقتول کا علاج خود اُسکا قاتل کرے۔
ہاں! راہ محبت میں ایک عاشق تھا جو بہت جلد ختم ہو گیا
اور اُس آرزو میں کامیاب نہ ہوا جو وہ دل میں لئے ہوئے تھا

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۲۷۸)

جب ان دونوں کے عشق و محبت کا چرچہ قبیلہ میں پھیلا تو ظریفہ کے اعزہ نے غریب زرعہ کے قتل کی ٹھان لی، عشق کا مارا زرعہ جان بچا کر بھاگا، مگر چلتے چلتے چند اشعار اپنے ایک دوست کو یاد کرا دئے اور کہا کہ موقع دیکھ کر ظریفہ کو سنا دینا، اشعار کا مفہوم یہ ہے :-

"ایک مریض عشق ہے جو قبیلہ کے گھروں کے قریب ایک گوشہ میں پڑا تڑپ رہا ہے، نہ اس کی دوا ہے نہ علاج، لوگ مایوس ہو کر کہتے ہیں کہ تم اُس کی عیادت کو آؤ گی تو وہ جی جائے گا۔ اور جب وہ تم سے مہربانی کی درخواست کریں گے تو تم بخل نہ کرو گی۔"

ظریفہ نے جب یہ اشعار سنے تو فوراً سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو یہ زرعہ کا پیام ہے جو اس نے اس طرح مجھ تک پہونچایا ہے، روتی پیٹتی گھر سے باہر نکل آئی اور جواب میں اس نے فی البدیہہ یہ چند شعر کہے جو بلاغت کی جان کہے جانے کے مستحق ہیں۔

۱ — رعی اللہ من ہام الفواد بحبہ
ومن کدتُ من شوق الیہ اطیر۔

۲ — لئن کثرت بالقلب اتراح لوعتہ
فان الوشاۃ الحاضرین کثیر۔

۳ — فان لم ازر بالجسم خیفۃ معشر
فللقلب آتٍ نحوکم فیزور۔

خدا اُس کی حفاظت کرے جس کا دل محبت میں بے چین ہے
اور جس کیلئے میرا جی چاہتا ہے کہ اڑ کر اُسکے پاس پہونچ جاؤں
ہر چند دل میں محبت کے شعلے بہ کثرت اُٹھ رہے ہیں
مگر کیا کروں چغلی کھانے کی بھی کمی نہیں۔
اگرچہ قبیلہ کے ڈر کی وجہ سے میں تم سے بظاہر نہیں مل سکتی
مگر دل روزانہ تمہارے پاس جاتا ہے اور زیارت کرتا ہے۔

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۲۷۹)

زمانہ جاہلیت میں جب اہل عرب کی شاعری بلاغت کے معراج پر پہونچی ہوئی تھی۔ سخن سنجی و شعر گوئی کا

بازار گرم تھا تو صدہا ایسی خواتین پیدا ہوئیں جن کے کارنامے ادبیات کی تاریخ میں غیر فانی نقوش چھوڑ گئے۔ اس دور کی مایۂ ناز شاعرہ خنسآ کا دیوان جس نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ آج بھی دنیائے ادب اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جیساکہ صدیوں پہلے قاصر تھی۔

سوق عکاظ میں جو زمانۂ جاہلیت میں نازک خیال اور رنگیں طبع شعراء کا دنگل سمجھا جاتا تھا شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور دل کھول کر داد سخن دیجاتی تھی، اُن میں شعراء کے ساتھ ساتھ اُس زمانہ کی صاحب علم و فضل خواتین بھی شریک ہوتی تھیں جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر خنسا ہے۔ جب یہ آتی تھی تو اپنے بھائی صخر کو یاد کر کے خود روتی تھی اور سارے مجمع کو بھی رلاتی تھی، اُس کے کجاوہ پر ایک سیاہ جھنڈا نصب ہوتا تھا جو اس بات کا نشان سمجھا جاتا تھا کہ وہ اہل عرب میں سب سے زیادہ مظلوم ہے۔

عہد بنوامیہ کے مشہور اُستاد جریر سے کسی نے پوچھا "اشعر العرب" (سب سے بڑا شاعر عرب کا کون ہے؟) اُس نے جواب دیا اگر خنسآء نہ ہوتی تو میں کہتا کہ میں ہوں اسی طرح ایک مرتبہ عہد بنو عباس کے بلیل القدر شاعر بشار نے تذکرةً کہا کہ عورتیں جب شعر کہتی ہیں تو اُس میں اُن کی فطری کمزوری کا اظہار ضرور ہو جاتا ہے کسی نے کہا کیا خنسآء کے کلام میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے، اُس نے کہا "تلک فوق الرجال" (وہ تو مردوں سے بھی بازی لے گئی ہے)[۱]

نابغہ ذبیانی جو زمانہ جاہلیت کا مشہور شاعر تھا، خنسآء کا بڑا احترام کرتا تھا، جب وہ سوق عکاظ کے مشاعروں میں شریک ہوتی تھی تو نابغہ اُس کے لئے خاص اہتمام کرتا تھا، سرخ چمڑے کا ایک خیمہ لگایا جاتا تھا جس میں بڑی عزت کے ساتھ صدر مقام پر اُس کو بٹھایا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ وہ آئی تو حسن اتفاق سے امام فن ابو بصیر اعشیٰ، حضرت حسان اور اُس زمانہ کے دوسرے مشہور شعراء موجود تھے سب سے پہلے ابو بصیر اعشیٰ نے اپنا کلام سنایا پھر حضرت حسان نے پھر اوروں نے، سب کے آخر میں خنسآء نے اپنے دل ہلا دینے والے اشعار سنائے اور خوب خوب داد حاصل کی، نابغہ پر تو وجد کی کیفیت طاری ہو گئی بے اختیار بول اُٹھا۔

لولا اِنّ ابا بصیر انشدنی آنفاً
لقلتُ انکِ اشعرُ الجن والانس

اگر ابوبصیر نے ابھی اپنا کلام نہ سنایا ہوتا تو میں یہی کہتا کہ تم جن و انس میں سب سے زیادہ باکمال شاعرہ ہو۔

(کتاب الشعر والشعراء مطبوعہ لندن صفحہ ۱۹۸)

---

[۱] الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۱۱۱

حضرت حسان نے خیال کیا کہ نابغہ نے در اصل مجھ پر چوٹ کی ہے خفا ہو گئے اور کہنے لگے نابغہ تم نے کیا کہا ہے، خدا کی قسم میں تم سے، تمہارے باپ سے اور تمہارے دادا سے بھی اچھا شاعر ہوں۔

نابغہ نے حضرت حسان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا خفا ہونے کی بات نہیں، لو سنو اور انصاف کرو، پھر خنسا سے دوبارہ اشعار سنانے کی درخواست کی، اور کہا میرا مطلب یہ تھا کہ وہ عورتوں میں سب سے بڑی شاعرہ ہے۔ خنسار نے یہ سنا تو ناگوار ہوا، ڈانٹ کر بولی "خوشامد نہ کرو، میں مردوں سے بھی زیادہ اچھی شاعرہ ہوں۔

خنسار کا اصلی نام "تماضر بنت عمرو بن الشرید السلیمیہ" تھا اور خنسا، لقب جو بعد میں اس قدر مشہور ہوا کہ لوگ اس کا اصلی نام بھول گئے، اُس کے دو بھائی تھے، صخر بن عمرو اور معاویہ بن عمرو۔ صخر کو بنو اسد نے اور معاویہ کو بنو مر بن غطفان نے قتل کر دیا تھا۔ اُس کا سارا دیوان انھیں دونوں کے مرثیوں سے بھرا پڑا ہے، نمونتاً چند اشعار درج ذیل ہیں:-

۱- اعینی جودا ولا تجمدا
الا تبکیان لصخر الندا

اے میری دونوں آنکھوں آنسو بہائے جاؤ اور کبھی خشک نہ ہو
کیا صخر کی داد و دہش کی یاد پر تمہیں رونا نہیں آتا۔

۲- الا تبکیان الجری الجمیل
الا تبکیان الفتی السیدا

کیا تم ایک بہادر و خوبرو کی جدائی پر آنسو نہیں بہاتیں؟
کیا تم اُس نوجوان سردار پر نہیں روتیں؟

۳- طویل النجاد رفیع العماد
وساد عشیرتہ امردا

جس کی تلوار کا پرتلا سب سے لمبا اور جس کا مرتبہ سب سے زیادہ بلند تھا
اور جو لڑکپن ہی سے اپنے قبیلہ پر سرداری کرتا تھا۔

۴- اذا القوم مدوا بایدیہم
الی المجد مد الیہ یدا

جب لوگ اسکی مدد طلب کرنے کے لئے دست سوال پھیلاتے تھے
تو وہ عزت و شرافت کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیتا تھا۔

(کتاب الاغانی مطبوعہ مصر جلد سیزدہم صفحہ ۱۴۲)

شاعری میں کمال حاصل ہونے کے علاوہ خنسا کا شمار زمانہ جاہلیت کی ان بہادر خواتین میں تھا جو میدان جنگ میں ہمیشہ مردوں کے دوش بدوش شریک رہتی تھیں، مجروحین کی مرہم پٹی کرتی تھیں اور مقتولین کی لاش اُٹھاتی تھیں۔ خنسار کے چار بیٹے تھے چاروں جنگ قادسیہ میں شریک ہوئے تھے، خنسار نے انھیں وصیت کر دی تھی کہ وہ کسی حالت میں بھی پیٹھ نہ دکھائیں۔ چنانچہ وہ سب یکے بعد دیگرے شہید ہوئے اور جب اسکی اطلاع خنسار کو پہونچی تو اُس نے کہا۔ "الحمد للہ الذی شرفنی بقتلہم" (خدا کا شکر ہے اس عزت پر جو مجھے انکے قتل ہو جانے سے نصیب ہوئی)

[1] آداب اللغۃ العربیہ جلد اول صفحہ ۱۳۹

خنساء کی ایک پھوپھی کا نام بھی "تماضر بنت الشرید السلیمیہ" ہے وہ بھی اپنے زمانہ کی بڑی زبردست شاعرہ تھی قبیلہ غطفان اور ہوازن کا سردار زہیر بن جذیمہ اُس کا شوہر تھا، جس کو خالد بن جعفر عامری نے جنگ نفراوات میں قتل کر دیا تھا اور اُسکے بعد اُس کے بیٹے مالک بن زہیر کو غداری سے قتل ڈالا، تماضر نے جب یہ خبر سنی تو بیٹے کی جواں مرگی پر اُس نے ایک دلدوز اور پر اثر مرثیہ کہا جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

۱۔ کانّ العین خالطہا قذاھا لحزنٍ واقعٍ افنیٰ کراھا	گویا آنکھیں غبار آلود ہو گئی ہیں۔ ایک غم کی وجہ سے جس نے آنکھوں کی نیند اچاٹ کر دی ہے۔
۲۔ علیٰ ولدٍ وزین الناس طرّاً اذا ما النار لم تر من صلاھا۔	میں ایک ایسے بچہ پر آہ وزاری کر رہی ہوں جو تمام لوگوں کیلئے زینت و فخر کا باعث تھا مہمانوں کیلئے اُسکی آگ روشن رہتی تھی جب کوئی دوسرا اُسے روشن نہ کرتا تھا
۳۔ لئن حزنت بنو عبس علیہ فقد فقدت بنو عبس فتاھا	اگر بنو عبس اُس پر رنج کریں تو کوئی تعجب نہیں اس لئے کہ انھوں نے اپنے ایک نوجوان کو کھو دیا ہے۔
۴۔ حذیفۃ لا سُقیت من الغوادی ولا روتک ھاطلۃٌ نداھا	حذیفہ خدا کرے تو صبح آنے والے بادلوں سے کبھی سیراب نہ ہو اور نہ ابر کرم کی تجھ پر کبھی بارش ہو۔
۵۔ کما فجعتنی بفتیً کریمٍ ، اذا وزنت بنو عبسٍ علاھا	تو نے ایک شریف نوجوان کو قتل کر کے مجھے دکھ پہونچایا ہے۔ جو اگر تمام بنو عبس کے مقابلہ میں تولا جاتا تو وہی گراں ثابت ہوتا
۶۔ فدمعی بعدہ ابداً ھطولٌ ، ولا یرقاء من عینی بکاھا	میرے آنسو اُس کے بعد ہمیشہ جاری رہیں گے اور میری آنکھیں اُس پر آہ وزاری سے کبھی خشک نہ ہوں گی۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول ص۲۳۷)

علامہ جرجی زیدان نے زمانہ جاہلیت کی ان مشہور خواتین میں جن کی شاعری اور ادیبانہ بذلہ سنجی پر ساری صنف نسواں کو ناز تھا خنساء کے بعد لیلی العفیفہ، جلیلہ بنت مرہ اور خرنق (طرفہ کی بہن) کا نام لیا ہے اور اُن کو اس دور کی باقی ماندہ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والی خواتین پر ترجیح دی ہے، ذیل میں ہم ان کے کلام کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

لیلی العفیفہ۔ لکیز بن مرہ کی بیٹی تھی، بچپن ہی میں اُس کی شادی براق بن روحان مری کے ساتھ ہو گئی تھی، براق بن روحان اور اُس کا چھوٹا بھائی غرثان بن روحان قبیلہ بنو ربیعہ کے مشہور شہسوار اور بہادر سردار تھے، غرثان اُس جنگ میں مارا گیا جو ۱۶ھ ء میں بنو ربیعہ اور بنو ایاد و لخم کے درمیان واقع ہوئی تھی لیلی العفیفہ غرثان کی جواں مرگی پر آنسو بہاتی ہے اور اُسکو تنہا چھوڑ جانے پر بنو ربیعہ کو ملامت کرتی ہے۔

۱۔۔۔ لما ذکرتُ غریثًا زادنی کمدی، حتی ھممتُ من البلوی باعلان

میں جب غریث کو یاد کرتی ہوں تو میرے دلمیں رنج وغم کا ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے حتی کہ میں چاہتی ہوں اس مصیبت کو آشکارا کر دوں۔

۲۔۔۔ تربع الحزن فی قلبی فذبتُ کما ذاب الرصاص اذا اصلی بنیران۔

غم میرے دل پر چھایا ہوا ہے اور میں رنج میں اسطرح پگھل رہی ہوں جس طرح سیسہ جب وہ آگ پر رکھا جاتا ہے۔

۳۔۔۔ فلو ترانی والاشجان تقلقنی عجبت براق من صبری وکتمانی

اگر تم مجھے دیکھو اس حال میں رنج وغم مجھے تکلیف پہونچا رہے ہیں تو براق تم میرے صبر وضبط پر تعجب کرو۔

۴۔۔۔ یا عین فابکی وجودی بالدموع ولا تمل یا قلب ان تبلی باشجان

اے آنکھ رو اور آنسو بہا
اے دل ملول مت ہو جبکہ رنج والم سے تو گھلا جا رہا ہے۔

۵۔۔۔ فذکر غرثان مولی الحی من اسد انسی حیاتی بلا شک وانسانی۔

غرثان کی یاد نے جو قبیلہ بنو اسد کا سردار تھا مجھے اور میری زندگی کو مجھ سے بھلا دیا ہے۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول صـ۲)

جلیلہ بنت مرہ، جساس بن مرہ کی بہن اور کلیب بن ربیعہ کی بیوی تھی، بدقسمتی سے جساس اور کلیب میں ان بن ہو گئی اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے، کلیب کہا کرتا تھا کہ "میں بزدلوں کی باتوں کا کچھ خیال نہیں کرتا، مرد ہو تو میدان میں آئے"۔ جس کا جواب جساس یہ دیتا تھا کہ "گھبراؤ نہیں میدان جنگ جلد فیصلہ کر دے گا کہ ہم میں سے کون سچا ہے اور کون جھوٹا"۔ یہ سب کچھ شاعری میں سوال وجواب ہوا کرتے تھے مگر جب کبھی سامنا ہو جاتا تھا تو دونوں جان دینے اور جان لینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے، ایسے مواقع پر غریب جلیلہ بیچ میں پڑ کر دونوں کو خونریزی سے بچا لیتی تھی، مگر یہ روک تھام تا کجے؟ آخر ایک دن ایسا آیا کہ یہ ساری تدبیریں بیکار گئیں اور قسمت کا لکھا پورا ہوا، جساس اور عمرو بن حارث نے مل کر کلیب کو قتل کر دیا۔

کلیب اپنے قبیلہ کا سردار تھا، اُس کی موت کوئی معمولی موت نہ تھی، قبیلہ کی جوان اور بوڑھی تمام عورتیں گریباں چاک سر پر خاک اُڑائے ہوئے ماتم کر رہی تھیں کہ دفعتًا کسی کی نگاہ ناکردہ گناہ جلیلہ پر پڑی سب کے دلوں میں شعلۂ انتقام بھڑک اٹھا، انھوں نے کلیب کی بہن اسماء سے کہا۔ "ہمارے ماتم کدہ میں جلیلہ کی موجودگی ہمارے لئے باعث ننگ ہے، یہ تو کلیب کے قاتل کی بہن ہے، اسے یہاں سے فوراً نکالو"۔

اس مشورہ کی فوراً تعمیل کی گئی اور مصیبت کی ماری جلیلہ روتی پیٹتی وہاں سے چل کھڑی ہوئی، اُس وقت اُس نے جو شعر کہے تھے اُن میں سے چند یہ ہیں:۔

۱— یا ابنۃ الاقوام ان لمت فلا
تعجلی باللوم حتے تسأ لی۔

اے خاتونو، اگر تم ملامت ہی کرنا چاہتی ہو تو جلدی نہ کرو
اور مجھ سے پوچھ تو لو کہ کیا بات ہے۔

۲— فاذا انت تبینت الذی
یوجب اللوم فلومی واعذلی

اگر تمھیں معلوم ہو جائے کہ میں واقعی ملامت کی مستحق
ہوں تو شوق سے ملامت کرو اور برا بھلا کہو۔

۳— ان تکن اُختٌ امرئٍ لیمت علی
شفقٍ منہا علیہ فافعلی۔

پھر اگر کسی کی بہن پر محض اسلیئے ملامت کیجا سکتی ہے، کہ اُسے
اپنے بھائی سے محبت تھی تو بھی ضرور کرو۔

۴— یا کلیب انت لی ذخر المنی
کنت عزی ورداءُ المسبل

کلیب! تو ہی میری آرزوؤں کا مرکز تھا
تو ہی میری عزت تھا اور میرے فخر کا سرمایہ تھا۔

۵— ما اظن الدھر یاتی مثلہ،
فارس الحرب ومردی البطل

میں جانتی ہوں کہ زمانہ اُس جیسا اب پیدا نہیں کر سکیگا۔
وہ جو معرکۂ جنگ میں بہادر شہسوار تھا اور بڑے بڑے نوجوانوں کو تباہ کر کے چھوڑتا تھا

۶— جلّ عندی فعل جساس فیا
حسرتی عما انجلت اوتنجلی

مجھ پر جساس کی یہ حرکت بہت گراں گذری اور
جو کچھ ہو چکا یا ہونے والا ہے اس پر افسوس کرتی ہوں۔

۷— فعل جساس علی وجدی آ
قاطع ظہری ومدنٍ اجلی

ہر چند مجھے جساس سے محبت ہے مگر اسکی اس حرکت نے
مری پیٹھ توڑ دی اور میری موت مجھ سے قریب تر کر دی۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول ص۱۱)

خرنق بنت بدر بن ھفان الثعلبی زمانہ جاہلیت کے مشہور شاعر طرفہ بن عبد کی اخیافی بہن تھی، یہ بھی اپنے زمانہ کی بڑی قادر الکلام شاعرہ تھی، اُس کے اشعار کا مجموعہ دیوان کی شکل میں بیروت میں چھپ گیا ہے، اُس کا زمانہ عہد اسلام سے تقریباً ستّر سال پیشتر تھا، اُس کا بیٹا عبد عمرو بن بشر بادشاہ حیرہ عمرو بن ہند کا مصاحب تھا، جب اُس کا انتقال ہوا تو دنیا اُس کی نظروں میں تاریک ہو گئی وہ اُس کے فضائل کا تذکرہ کرتے ہوئی کہتی ہے:۔

۱— الا ھلک الملوک وعبد عمرو
وخلیت العراق لمن بغاھا

ہاں! سلاطین مٹ گئے اور عبد عمرو بھی ہلاک ہو گیا،
اور عراق اُس شخص کیلئے خالی کر دیا گیا جو اُس پر دھاوا بولے

۲— فلم من والدلک یا ابن بشر
تازر بالمکارم وارتداھا،

اے ابن بشر، تیرے باپ جیسے کم لوگ ہونگے جو سر سے پاؤں
تک بزرگی کے لباس فاخرہ سے آراستہ تھا۔

۳— بنی لک مرثد وابوک بشرٌ
علی النجم البواذخ من ذراھا

مرثد اور تیرے باپ بشر نے تیرے مفاخر
پہاڑ کی چوٹیوں سے بھی زیادہ بلند کر دئے۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول ص۲۶)

زمانۂ جاہلیت کی ان مشہور خواتین میں جن کا کلام کتب ادب و شاعری میں کثرت سے ملتا ہے۔ خنسآ، جلیلہ بنت مرہ، لیلی العفیفہ، خرنق اخت طرفہ کے علاوہ اُمیمہ بنت امیہ بن عبد شمس، خالدہ بنت ہاشم، کبشہ بنت عمرو بن معدی کرب، عیثمہ بنت جابر، سلمی بنت المہلہل، سلمی بنت مالک بن بدر، ہند بنت حذیفہ فارعہ بنت شداد، اروی بنت حباب، صفیہ بنت عمرو، میہ بنت ضرار، لیلی بنت وھب، مریم بنت طارق وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جلیل الرحمن اعظمی

حدیث حسن

مصور جذبات جناب فطرت واسطی کی پچاس ولولہ انگیز اور سحر اثر نظموں کا مجموعہ ہے جسکی ہر نظم محبت کے لطیف جذبات کی آئینہ دار۔ لطف زبان سے رنگین حسن تخیل سے مزین۔ ندرت بیان میں معجز نما اور رومانی شاعری کا شاہکار ہے۔ حدیث حسن کی تقریبًا نصف نظمیں، نگار، شاہکار، زمانہ اور دوسرے مشاہیر رسالوں میں شائع ہوکر خراج تحسین اور غیر فانی شہرت حاصل کرچکی ہیں۔ اس مجموعہ میں رئیس التحریر حضرت نیاز فتحپوری کی تقریظ کے علاوہ ملک کے دو مایۂ ناز ادیبوں کے فاضلانہ مقدمات شامل ہیں۔ حدیث حسن ۱۱۲ صفحات میں دو تصاویر، بہترین کتابت۔ کلکتہ کی بنی ہوئی خوشنما جلد اور غیر معمولی آب و تاب کے ساتھ بتیس پونڈ کے چکنے کاغذ پر زیور طبع سے آراستہ ہے اور باوجود ان محاسن صوری و معنوی کے قیمت صرف (عمر) علاوہ محصول ہے۔ المعلن: منیجر رسالہ شاہکار گورکھپور (یو، پی)

ضرورت ہے

سنہ ۲۲ء فروری تا جون۔ اگست و نومبر۔ سنہ ۲۳ء مارچ اپریل اگست و دسمبر۔ سنہ ۲۴ء ستمبر۔ سنہ ۲۵ء جنوری اگست۔ اکتوبر، نومبر و دسمبر۔ سنہ ۲۶ء مارچ تا مئی۔ ستمبر تا دسمبر۔ سنہ ۲۷ء فروری۔ جولائی تا دسمبر۔ سنہ ۲۸ء جنوری، فروری۔ اپریل تا جولائی۔ ستمبر تا دسمبر۔ سنہ ۲۵ء جنوری، اپریل تا جولائی۔ ستمبر تا نومبر۔ سنہ ۳۰ء جنوری، اپریل تا جولائی۔ دسمبر۔ سنہ ۳۱ء جنوری، اپریل و مئی۔ سنہ ۳۲ء اپریل۔ سنہ ۳۳ء جون اگست و ستمبر۔ سنہ ۳۴ء جنوری، فروری، اگست و نومبر۔ سنہ ۳۵ء اکتوبر۔

منیجر نگار لکھنؤ

ضلع کا ڈاکٹر

ایک مرتبہ موسم خزاں میں جب میں ملک کے دور دراز حصہ سے واپس آرہا تھا مجھے سردی لگ گئی اور میں بیمار پڑ گیا۔ جسوقت بخار آیا خوش قسمتی سے میں گاؤں کی سرا میں تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو بلا بھیجا ڈاکٹر کا قد اوسط بال سیاہ اور جسم لاغر تھا۔ اُس نے مجھے دیکھ کر ایک نسخہ لکھدیا اور جیب میں ۵ روبل کا نوٹ رکھتے ہوئے کھانسکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کے بعد وہ جانے والا ہی تھا کہ یکایک کسی وجہ سے باتیں کرنے لگا اور بجائے جانے کے میرے ہی پاس ٹھہر گیا۔ میں بخار سے بے چین ہورہا تھا اور اس خیال سے کہ رات کو نیند تو آنے کی نہیں اس نئے دلچسپ دوست کے ساتھ باتیں کرنے میں مجھے بھی بہت مسرت ہورہی تھی۔ تھوڑی دیر میں چاء آئی اور ڈاکٹر نہایت بے تکلفی سے گفتگو کرنے لگا۔ وہ آدمی سمجھدار معلوم ہوتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا بہت پرزور طریقہ سے، جس میں ایک حد تک ظرافت بھی پائی جاتی تھی۔۔۔ دنیا بھی عجیب وغریب جگہ ہے۔ ہم سب اکثر لوگوں کے ساتھ ایک طویل مدت تک رہتے ہیں، ان سے دوستانہ تعلقات بھی ہوتے ہیں تاہم ان سے ایک دفعہ بھی آزادی اور بے تکلفی سے گفتگو نہیں کرتے۔ لیکن بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی سے ملاقات ہوئے بمشکل سے چند منٹ ہوتے ہیں کہ ہم یا وہ ایک دوسرے پر اپنے تمام رازدل عیاں کرنے لگتے ہیں اب میں یہ نہیں جانتا کہ اُس ڈاکٹر کو میرے اوپر اس قدر اعتماد کیونکر ہو گیا اور کیوں اُس نے مجھے ایک نہایت دلچسپ قصہ سنایا۔ بہرحال میں ڈاکٹر ہی کے الفاظ میں وہ قصہ بیان کرتا ہوں:۔

"تم نہ جانتے ہوگے" اُس نے ایک کمزور آواز میں کہنا شروع کیا "تم یہاں کے جج میلوبیولی لوچ کو نہ جانتے ہوگے؟۔۔۔۔ تم اُسے نہیں جانتے ہو؟۔۔۔۔ خیر ہوگا" (اُس نے اپنا گلا صاف کیا اور آنکھیں ملیں)

"اچھا۔ تو یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب نہٹے میں برف پگھلنے کا زمانہ آچکا تھا۔ میں اُس کے یعنی جج کے مکان پر بیٹھا "پریفرنس" (تاش کا ایک کھیل) کھیل رہا تھا۔ جج بڑا اچھا آدمی ہے اور اُسے "پریفرنس" کھیلنے کا بڑا شوق ہے۔ یکایک (ڈاکٹر اس لفظ "یکایک" کو بہت استعمال کرتا تھا) کسی نے مجھ سے آکر کہا کہ آپ کو ایک نوکر بلا رہا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ کیا چاہتا ہے، مجھے جواب ملا وہ ایک خط لایا ہے جو غالباً کسی مریض نے

بھیجا ہے میں نے وہ خط مانگ لیا اور اُسے پڑھکر کہا کہ ہاں یہ ایک مریض ہی کا خط ہے ۔۔ وہ خط ایک خاتون ۔۔ ایک بیوہ خاتون کا تھا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ میری لڑکی مر رہی ہے ۔ خدا کے لئے آجائیے ۔ آپ کے لئے سواری بھیجدی گئی ہے ۔۔۔ مگر مشکل یہ تھی کہ وہ خاتون قصبہ سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر رہتی تھی نصف شب گزر چکی تھی اور سڑکوں کی حالت بہت خراب تھی ۔ اور چونکہ وہ خود غریب تھی اس لئے کسی کو اُس سے دو نقرئی روبل سے زیادہ کی توقع بھی نہ ہو سکتی تھی بلکہ اُس میں بھی شک تھا ۔ بہرحال تم جانتے ہو، فرض سب پر مقدم ہے ۔۔ ممکن تھا کہ ایک بنی آدم کا انتقال ہو جائے لہٰذا میں نے سپتے تو کیلیوین کو جو صوبجاتی کمیشن کا ممبر ہے دیدئے اور خود گھر آیا ۔ یہاں آکر میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی معمولی، بدصورت گاڑی زینہ کے پاس کھڑی ہے ، گھوڑے اُس میں کسی کسان کے جتے تھے جو بہت موٹے تھے ۔ گاڑی بان ادب کے مارے اپنی ٹوپی اُتارے بیٹھا تھا ۔ دیکھ کر میں اپنے دل میں سوچنے لگا " چلو یہ بات تو صاف ہو گئی کہ مریض رئیس نہیں ہے "۔۔ آپ ہنس رہے ہیں، لیکن بات یہ ہے کہ مجھ ایسے غریب آدمی کو ہر چیز کا خیال رکھنا پڑتا ہے ۔ اگر گاڑیبان شہزادہ کی طرح بیٹھا رہے، اپنی ٹوپی نہ اُٹھائے ، تم کو گھور کر دیکھے اور اپنا کوڑا اسٹر اسٹر چلاتا رہے تو یہ یقینی ہے کہ معاملہ ۶ روبل والا ہے ۔ لیکن اس معاملہ کا رنگ اور تھا ۔ خیر، تو میں ضروری دوائیں ساتھ لے کر چلدیا اور کسی نہ کسی طرح وہاں پہونچ بھی گیا ۔ البتہ سڑک کیا تھی گویا جہنم کا راستہ تھی ۔ چشمے بھی تھے ، برف بھی تھی اور سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ ایک جگہ یکایک بند بھی ٹوٹ گیا تھا ۔ بہرحال مریضہ کا گھر آگیا ۔ مکان پھوس کا بنا تھا ، کھڑکی میں روشنی تھی جس کے معنی یہ تھے کہ وہ لوگ میری آمد کے متوقع تھے ۔ دروازہ پر ایک ضعیف اور معزز عورت کھڑی ہوئی تھی ۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی کہا " اُسے بچا لیجئے ؟ وہ مر رہی ہے !" میں نے جواب دیا " پریشان نہ ہوجئے ۔ مریض کہاں ہے ؟'۔ عورت نے کہا ' اِدھر آیئے '۔ میں اس کے ساتھ ایک چھوٹے سے صاف کمرہ میں پہونچا ۔ بستر پر ۲۰ برس کی ایک لڑکی بیہوش پڑی ہوئی تھی ۔ اُس کا بدن پھنکا جا رہا تھا اور وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی ۔۔ اُس کو بخار چڑھا تھا ! قریب ہی دو اور لڑکیاں بیٹھی تھیں جو اس کی بہنیں تھیں ۔ ان کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے ۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں ، کل تک ان کی طبیعت بالکل اچھی تھی اور اشتہا بھی کافی تھی ۔ آج صبح دردِ سر کی شکایت ہوئی اور شام تک یکایک وہ حالت ہو گئی جو آپ دیکھ رہے ہیں " میں نے ان سے بھی اس کے جواب میں یہی کہا ' گھبراؤ نہیں ، " آپ جانئے ! یہ ڈاکٹر کا فرض ہے ۔۔ میں اُس کے قریب گیا ، نبض دیکھی ، لیپ لگانے کو کہا اور ایک نسخہ لکھ دیا ۔ اس اثنا میں میں نے اُس کی طرف دیکھ بھی لیا تھا ـــــــ میں نے اُسے وہیں دیکھا ـــــــ واللہ ! میں نے ایسا چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا ۔۔ مختصراً یہ کہ وہ حسن کا مجسمہ تھی ۔ مجھے اُس پر بے انتہا

رحم معلوم ہوا ــــ ایسے حسین خط و خال! ایسی پرکیف آنکھیں!.... مگر خدا کا شکر ہے کہ اُس کی حالت سنبھل گئی۔ اُسے پسینہ آگیا اور وہ ہوش میں آتی معلوم ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے چاروں طرف دیکھا مسکرائی اور اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ یہ دیکھتے ہی اُس کی بہنیں جھک کر اُس سے دریافت کرنے لگیں۔ "تم اب کیسی ہو؟" اُس نے جواب دیا "اچھی ہوں" اور یہ کہکر اُن کی طرف سے گھوم گئی۔ میں نے اُس کی طرف پھر دیکھا۔ وہ سو گئی تھی ــ میں نے اس پر اُن لوگوں سے کہا "اب مریض کو تنہا چھوڑ دیا جائے"۔ اس کے بعد ہم سب لوگ خاموشی سے دوسری طرف چلے گئے اور کمرہ میں صرف ایک خادمہ احتیاطاً چھوڑ دی گئی۔ برآمدہ میں ایک میز پر سماوار اور ایک شیشہ شراب کا رکھا تھا۔ ہم لوگوں کے پیشہ میں بغیر اس کے کام نہیں چل سکتا۔ لڑکیوں نے مجھے چاء دی اور مجھ سے درخواست کی کہ رات کو وہیں ٹھہر جاؤں ــ میں نے اسے منظور کر لیا کیونکہ اُس وقت جا ہی کہاں سکتا تھا۔ مگر وہ ضعیف عورت برابر آہ و زاری کرتی رہی تو میں نے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے وہ اچھی ہو جائے گی آپ پریشان نہ ہوجیے بلکہ تھوڑا سا آرام کر لیجیے۔ اسوقت دو بجا ہے۔ اس پر وہ کہنے لگی کہ اگر کوئی خاص بات ہوگی تو مجھے جگا لیجیے گا؟ میں نے کہا "ہاں"۔ یہ سن کر وہ چلی گئی۔ لڑکیاں بھی اپنے کمرہ میں چلی گئیں اور میرے واسطے انھوں نے برآمدہ میں بستر بچھا دیا۔ میں بھی بستر پر جا کر لیٹ گیا مگر تعجب یہ ہے کہ مجھے نیند نہیں آئی حالانکہ میں بہت تھکا ہوا تھا ــ واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے مریض کا تصور اپنے دماغ سے دور نہیں کر سکتا تھا۔ بالآخر مجھے تاب نہیں رہی اور میں یکایک اُٹھ بیٹھا اور سوچنے لگا کہ جا کر دیکھ آؤں کہ مریضہ کیسی ہے۔ اُس کے سونے کا کمرہ برآمدہ سے ملا تھا۔ میں اُٹھا اور چپکے سے دروازہ کھولا ــــ میرا دل دھڑک رہا تھا! میں نے اندر دیکھا! خادمہ سو رہی تھی، اُس کا منہ کھلا تھا اور کمبخت خراٹے بھی لے رہی تھی! مریضہ میری طرف منھ کئے لیٹی تھی۔ میں اُس کے قریب گیا.... مگر اُس نے یکایک آنکھیں کھول دیں اور میری طرف گھور کر چلانے لگی "کون ہے؟ کون ہے؟"۔ میں گھبرا گیا اور آخر کار اُس سے کہا "خاتون گھبراؤ نہیں۔ میں ڈاکٹر ہوں ــ دیکھنے آیا ہوں کہ اب کیسی ہو" وہ بولی "تم ڈاکٹر ہو؟" میں نے جواب دیا "ہاں، میں ڈاکٹر ہوں۔ تمھاری ماں نے مجھے قصبہ سے بلوا بھیجا۔ اب تم سو جاؤ اور خدا نے چاہا تو دو ایک روز میں تم تندرست ہو جاؤ گی۔" "ہاں۔ ڈاکٹر صاحب براہ مہربانی مجھے موت سے بچا لیجیے"! "تمھیں خدا اچھا کر دے تم اس طرح کیوں باتیں کرتی ہو؟" میں نے محسوس کیا کہ اُس کو پھر بخار معلوم ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے اُس کی نبض دیکھی۔ واقعی اُس کو بخار پھر چڑھ آیا تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔ "میں تم سے بتاؤں گی کہ میں مرنا کیوں نہیں چاہتی ــــ میں تم سے ضرور بتاؤں گی.... اس وقت ہم اکیلے ہیں ــــ البتہ براہ مہربانی آپ کسی سے .... کسی سے بھی کہہ نہ دیجئے گا.... اچھا سنئیے!..." میں جھک گیا۔

وہ اپنے ہونٹ میرے کان کے قریب لے آئی۔ اُس کے بال میرے رخسار کو چھو رہے تھے۔ میرا سر چکر کھا سا جانے لگا تھا۔ اتنے میں وہ کچھ کہنے لگی مگر میری سمجھ میں بالکل نہ آیا......... وہ بدحواس ہو گئی تھی.... وہ کانا پھوسی کرتی رہی مگر اتنی تیزی سے کہ گویا وہ روسی زبان ہی نہیں بول رہی ہے۔ آخر کار اُس نے اپنی کہانی ختم کی اور اپنا سر تکیہ پر رکھ لیا۔ اس کے بعد اُس نے اپنی اُنگلی سے مخاطب کر کے مجھ سے پھر کہا "ڈاکٹر صاحب یاد رکھیئے گا۔ کسی سے کہئے گا نہیں" میں نے اُسے کسی طرح چپ کیا، کچھ پینے کو دیا، نوکر کو جگایا اور پھر چلا گیا"

یہاں پر ڈاکٹر نے ہلاس لی اور اُس کے بعد پھر کہنا شروع کیا:۔

"بہرحال، دوسرے روز خلاف توقع مریضہ کی حالت اچھی نہ ہوئی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا جائے۔ اور یکایک یہ فیصلہ کیا کہ میں یہیں رہوں گا گو میرے دوسرے مریض میرا انتظار کر رہے ہوں گے.... اور آپ جانتے ہیں کہ کوئی شخص اُس سے بے پرواہی نہیں کر سکتا کیونکہ جو شخص ایسا کرتا ہے اُس کے پیشہ کو نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن سب سے پہلے تو میں نے یہ خیال کیا کہ مریضہ کی حالت خطرناک ہے اور دوسرے میں خود اُس کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اُس کا پورا خاندان اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ لوگ غریب تھے مگر پھر بھی بہت تعلیم یافتہ تھے...... ان کا باپ بہت قابل آدمی تھا۔ ایک مصنف! اُس کا انتقال مفلسی کی حالت میں ضرور ہوا تھا مگر اُس نے اپنی لڑکیوں کو تعلیم بہت معقول دلا دی تھی۔ کتابیں بھی وہ بہت بڑی تعداد میں چھوڑ گیا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ میں مریضہ کی بہت دیکھ بھال کرتا تھا، اس وجہ سے یا کسی اور وجہ سے نہیں کہہ سکتا ہوں کہ گھر بھر میرا اس طرح خیال کرتا تھا کہ جیسے میں بھی انھیں کے خاندان کا ہوں.......

اس اثنا میں سڑکیں اور بھی خراب ہو گئیں۔ تمام سلسلہ رسل و رسائل منقطع ہو گیا حتی کہ شہر سے دوائیں بھی بوقت تمام آسکتی تھیں..... بیمار لڑکی بھی اچھی نہیں ہو رہی تھی...... روز بروز......

لیکن...... یہاں......" (ڈاکٹر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا) "بھئی! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے کیسے بتاؤں!..." (اس نے پھر تھوڑی سی ہلاس لی، کھانسا اور ذرا سی چائے پی) "خیر! میں تم سے سیدھے سادے بیان کر دوں۔ میری مریضہ..... کیسے بتاؤں!.... ہاں تو وہ مجھ پر عاشق ہو گئی تھی.... یا نہیں۔ وہ عاشق نہیں ہوئی تھی.... بہرحال.... واقعی، کس طرح کہوں؟" (ڈاکٹر نیچے دیکھنے لگا اور اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے بعد جلدی سے کہنے لگا) "نہیں۔ واقعی وہ عاشق ہو گئی تھی۔ انسان کو اپنے آپ کو بہت نہ بڑھا دینا چاہئے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی، ہوشیار اور بڑی قابل، اور میں سمجھئے، لاطینی بالکل ہی بھول چکا تھا۔ رہ گئی صورت شکل (ڈاکٹر نے اپنی طرف مسکرا کر دیکھا) سو میں اس پر بھی کوئی فخر نہیں کر سکتا لیکن خداوند تعالیٰ نے مجھے بیوقوف نہیں بنایا ہے۔ میں سفید کو سیاہ نہیں سمجھتا ہوں۔ میں تھوڑا بہت

سمجھ بھی لیتا ہوں۔ مثلاً میں یہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ الکسنڈرا اینڈریونا ـــ یہ اُس کا نام تھا ـــ مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ایک دوستانہ رغبت تھی ـــ تعظیم و تکریم یا کچھ اسی طرح اُلجھی رہتی وہ خود اس جذبہ کو غلط سمجھتی تھی، مگر اس کا رویہ تھا ایسا ہی۔ اب آپ اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر نے جو یہ تمام غیر مربوط جملے سانس لئے بغیر بہت گھبراہٹ میں کہے چلا جا رہا تھا اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا) مجھے تعجب یہ ہو رہا ہے ـــ آپ اسے نہیں سمجھ سکتے ـــ اچھا تو میں آپ کی اجازت سے سلسلہ وار بیان کروں گا۔"

یہ کہکر اُس نے چاء کی پیالی پی اور پھر کچھ اطمینان سے کہنا شروع کیا:ـــ

"اچھا تو میری مریضہ کی حالت خراب ہوتی چلی گئی۔ آپ ڈاکٹر نہیں ہیں اور یہ نہیں سمجھ سکتے ہیں کہ غریب ڈاکٹر کے دل پر خصوصاً جب اُسے یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ بیماری اُس کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرتی جاتی ہے کیا گزرتی ہے اور وہ خود اپنے متعلق کیا خیال کرنے لگتا ہے۔ انسان اتنا پژمردہ ہو جاتا ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم ہر بات بھول گئے ہیں، مریض کو ہم پر اعتماد نہیں رہ گیا دوسروں کو بھی پتہ چلنے لگتا ہے کہ تم پریشان ہو۔ تمہاری طرف ان کا مشکوک نگاہوں سے دیکھنا اور کانا پھوسی کرنا ـــ اف! کسقدر تکلیف دہ چیز ہے! دل میں خیال آتا ہے کہ اس بیماری کا کوئی نہ کوئی علاج ضرور ہوگا بشرطیکہ سمجھ میں آجائے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے۔ تم ایک علاج کرتے ہو ـــ اور پھر کہتے ہو نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے ـــ اصل تو یہ ہے کہ تم دوا کو اپنا کام کرنے کے لئے کافی وقت ہی نہیں دیتے ہو۔۔۔ تم ایک چیز پکڑتے ہو اور پھر اُسے چھوڑ کر دوسری پکڑنے لگتے ہو۔ مگر اس اثناء میں ایک فردِ بشر آدم کی جان بھی جاتی ہے اور کوئی دوسرا ڈاکٹر اُسے بچا سکتا ہے تو تم کہتے ہو کہ کسی اور ڈاکٹر سے مشورہ کر لینا چاہیئے۔ مگر مطلب یہ ہے اتنے سے یہ بھی نکلتا ہے کہ میں اپنے اوپر ذمہ داری نہیں لوں گا۔ ایسے موقعوں پر تم کتنے بیوقوف معلوم ہوتے ہو مختصر یہ کہ آدمی مرجاتا ہے ـــ مگر اس میں تمہارا قصور نہیں ہے ـــ ہم نے اُس کا قاعدہ کی رو سے علاج کیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ چیز یہ ہے کہ تمہارے دستِ شفا پر دوسروں کو کامل اعتماد ہو مگر تم خود اس کا احساس کر رہے ہو کہ تم کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتے ہو۔ تو یہی کامل اعتقاد تھا جو الیگزینڈر بونا کا پورا خاندان مجھ پر رکھتا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گئے تھے کہ ان کی لڑکی کی حالت خطرناک ہے۔ میں بھی انکو یقین دلایا کرتا تھا کہ کوئی بات نہیں ہے مگر میرا دل اندر ہی اندر ڈوبتا جاتا تھا۔ آفت بالائے آفت یہ تھی کہ گاڑیبان دوا لینے کے لئے جاتا تھا تو شام تک واپس آتا تھا۔ میں مریضہ کے کمرہ سے باہر نہیں جاتا تھا، اصلیت یہ ہے کہ میں اُس سے علٰحدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ جانئے میں اُسے دلچسپ قصہ سنایا کرتا اور اُس کے ساتھ

تاش کھیلا کرتا تھا اور رات کو اُس کے پاس بیٹھ کر اُس کی تیمار داری کرتا تھا۔ بیچاری بڈھی ماں باچشم پر آب میرا شکریہ ادا کیا کرتی مگر میں اپنے دل میں خیال کرتا کہ میں شکریہ کا مستحق نہیں ہوں، ۔ میں آپ سے صاف صاف اس کا اقرار کرتا ہوں ـــ اب اُس کے چھپانے سے کوئی فایدہ نہیں ہے ـــ کہ میں اپنی مریضہ پر عاشق تھا۔ الکسنڈرا اینڈریونا کو بھی مجھ سے ایک لگاؤ ہو گیا تھا۔ بعض وقت وہ میرے علاوہ کسی اور کو اپنے کمرہ میں آنے تک نہیں دیتی تھی ۔ وہ مجھ سے خوب گفتگو بھی کرنے لگی اور اس قسم کے سوالات بھی کرنے لگی کہ میں نے تعلیم کہاں حاصل کی ۔ میں رہتا کس طرح ہوں ، میرے اعزہ کون لوگ ہیں اور میرے ملاقاتی کون کون ہیں ـ میں سمجھتا تھا کہ اُسے گفتگو نہ کرنا چاہیئے مگر تم جانتے ہو کہ میں اُسے منع نہیں کر سکتا تھا ـــ بعض وقت میں اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنے دل سے کہتا "بدمعاش ! تو کیا کر رہا ہے ؟" ـ ـ ـ ... مگر وہ میرا ہاتھ پکڑ لیتی ، دیر تک مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتی ، پھر گھوم جاتی اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگتی "تم کیسے اچھے آدمی ہو !" ـــ اُس کے ہاتھ میں بخار کا اثر معلوم ہوتا تھا ـــ اُس کی آنکھیں کیسی بڑی بڑی اور کیسی پر کیف تھیں !!.... وہ کہتی ہاں ـــ تم بہت اچھے اور رحمدل انسان ہو ۔ تم ہمارے اور ہمسایوں کی طرح نہیں ہو .... نہیں تم اُس طرح نہیں ہو .... میں ابھی تک تم سے کیوں نہ ملاقات کر سکی ، میں اس پر یہ جواب دیتا "اینڈریونا ! اطمینان رکھو ، تم پھر اچھی ہو جاؤ گی ۔" "اور میں آپ سے یہ بھی بتا دوں" ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اور آگے بڑھ کر اپنی ابروؤں کو چڑھاتے ہوئے کہا کہ "یہ لوگ اپنے ہمسایوں سے بہت کم تعلق رکھتے تھے کیونکہ چھوٹے آدمی ان کے برابر نہیں تھے اور خودداری ان کو امیروں سے ملنے نہیں دیتی تھی ـ بات یہ ہے کہ وہ نہایت تعلیم یافتہ گھر تھا اور یہ میرے لئے بہت اطمینان بخش چیز تھی ـ بہر حال اینڈریونا صرف میرے ہاتھ سے دوا پیتی تھی .... وہ خود اُٹھ پڑتی ـــ بیچاری غریب لڑکی ـــ میری مدد سے دوا پیتی اور میری طرف دیکھنے لگتی .... مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ گویا میرا دل پھٹا جا رہا ہے ـ مگر اس اثنا میں اُس کی حالت برابر خراب ہوتی جا رہی تھی اور میں اپنے دل میں یہ خیال کرتا کہ وہ مر جائے گی ، ضرور مر جائیگی ـ آپ یقین کیجیے کہ میں خود اُسکی جگہ قبر میں جانے کیلئے تیار تھا ـ اُسکی ماں اور بہنیں بھی مجھے دیکھا کرتیں ـ اور اب اُنکا مجھ پر اعتقاد کم ہو رہا تھا وہ مجھ سے دریافت کرتیں ـ "اب طبیعت کیسی ہے ؟" تو میں جواب دیتا "بالکل ٹھیک ، بالکل ٹھیک" ـ میرے ہوش و حواس در اصل درست نہ تھے ـ خیر ـ ایک رات میں اپنی مریضہ کے پاس اکیلا بیٹھا ہوا تھا ـ خادمہ بھی وہیں لیٹی تھی اور زور زور سے خراٹے لے رہی تھی ـ میں اُس غریب لڑکی کو مورد الزام نہیں بناتا ـ وہ بھی بہت تھک گئی تھی ـ اینڈریونا کی طبیعت اُس شام کو بہت خراب رہی تھی ـ اس وقت اُسے بہت بخار چڑھا ہوا تھا ـ نصف شب تک وہ کروٹیں بدلتی رہی آخر کار ایسا معلوم ہوا کہ اُس کو نیند آ گئی ہے یا کم از کم یہ کہ وہ بالکل ساکت لیٹ گئی تھی

کونے میں حضرت عیسیٰ کی تصویر کے سامنے لیمپ جل رہا تھا - میں وہاں اپنا سر جھکائے بیٹھا تھا بلکہ تھوڑا سا اونگھ بھی رہا تھا - یکایک مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے مجھے چھوا - میں گھوم پڑا ..... ہائیں! اینڈریونا مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی ..... اُس کے لب کُھلے ــــ اُس کے رخسار جل رہے تھے ــــ میں نے کہا :- "کیا بات ہے؟" "ڈاکٹر صاحب - کیا میں مرجاؤں گی؟" "نعوذ باللہ!" "نہیں - ڈاکٹر صاحب! نہیں مجھ سے نہ کہئے کہ میں زندہ رہوں گی ــــ ایسا نہ کہئے ..... اگر آپ جانتے ہوتے ..... سنئے! خدا کے لئے میری صحیح حالت نہ پوشیدہ رکھئے" اب اُس کی سانس تیزی سے چلنے لگی تھی - "اگر مجھے یہ یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ میں ضرور مرجاؤں گی ..... تو میں آپ کو سب کچھ بتا دوں ... سب کچھ!" "اینڈریونا - میں تم سے درخواست کرتا ہوں ــــ" "سنئے - میں مطلق نہیں سوئی ہوں ..... میں آپ کو بڑی دیر سے دیکھ رہی ہوں .... خدا کے لئے .... مجھے آپ پر اعتماد ہے - آپ بہت اچھے آدمی ہیں ــــ میں آپ سے دنیا کی تمام مقدس چیزوں کا واسطہ دلا کر پوچھتی ہوں ــــ مجھ سے سچ سچ بیان کر دیجئے - کاش کہ آپ یہ سمجھ لیتے کہ میرے لئے یہ کسقدر اہم ہے .... کیا میری حالت خطرناک ہے؟" "اینڈریونا - میں تم سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا - تمھاری حالت واقعی خطرناک ہے - مگر خدا بہت رحیم ہے" "میں مرجاؤں گی ــــ میں مرجاؤں گی" اسوقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ بہت خوش ہے - اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا - میں یہ حالت دیکھ کر گھبرا گیا مگر اینڈریونا بولی "ڈریئے نہیں - ڈریئے نہیں - مجھے موت کا خوف نہیں ہے" یہ کہکر وہ بیٹھ گئی اور اپنی کہنیوں پر جھک کر کہنے لگی "اب ..... ہاں ــــ اب میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ میں آپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں اور یہ کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں!" میں یہ سنکر حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا - میرے لئے یہ عجیب غریب چیز تھی مگر اینڈریونا نے پھر کہا "آپ سنتے ہیں! میں آپ سے محبت کرتی ہوں" "اینڈریونا! مجھے کس چیز نے اس قابل بنایا ہے کہ ــــ" "نہیں - نہیں - تم مجھے ..... تم مجھے .... سمجھ نہیں پائے ..." یہ کہکر اُس نے یکایک اپنے ہاتھ پھیلائے اور میرا سر پکڑ کر پیشانی چوم لی .... یقین کیجئے میں اس حرکت سے قریب قریب چیخ اُٹھا .... میں گھٹنوں کے بل جھک گیا اور اپنا سر تکیہ میں چھپا لیا - اینڈریونا خاموش لیٹی رہی اور اُس کی اُنگلیاں میرے سر کے بالوں سے کھیلتی رہیں - اتنے میں یکایک اُس نے رونا شروع کر دیا - میں اُسے خاموش کرانے اور اطمینان دلانے لگا .... مگر مجھے یہ نہیں یاد کہ میں نے اُس سے کیا کیا کہا -

"دیکھو تم اس خادمہ کو جگا دو گی ــــ اینڈریونا! میں تمھارا شکریہ ادا کرتی ہوں ــــ یقین کرو - پریشان نہ ہو" "بس - بس - کسی کی پرواہ مت کرو - اُس کو اُٹھ جانے دو - کمرہ میں آجانے دو - کچھ پرواہ نہیں ــــ میں مر رہی ہوں ــــ تم دیکھتے ہو .... اور تم ڈرتے کیوں ہو؟ تمھیں کس بات کا خوف ہے - اپنا سر اُٹھاؤ ....

اچھا شاید تم کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔ میں غلطی پر ہوں۔۔۔۔ یہ ہے تو مجھے معاف کر دو۔" "اینڈریونا تم کیا کہہ رہی ہو۔۔۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں ۔۔ اینڈریونا۔" اس پر اُس نے اپنی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور اپنے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ اچھا تو پھر مجھ کو اپنی آغوش میں لے لو!' میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر میں اُس رات کو پاگل کیوں نہیں ہو گیا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ میری مریضہ اپنا خاتمہ کئے ڈال رہی ہو۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پوری طرح اپنے حواس میں نہیں ہے۔ میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اگر وہ اپنے آپ کو موت کے قریب نہ دیکھتی تو میرا کبھی خیال نہ کرتی اور آپ خواہ کچھ بھی کہئے، مگر محبت سے آشنا ہوئے بغیر ۲۰ برس کی عمر میں مرجانا بڑی مشکل چیز ہے۔ یہ چیز۔۔۔ اُس کے لئے تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اُس نے ناامیدی میں مجھ سے اظہار عشق کیا۔ میں نے اُس سے کہا "اینڈریونا! میرے اوپر اور اپنے اوپر رحم کرو!" "کیوں ؟" وہ بولی۔ "خیال کس بات کا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں مرنے والی ہوں"۔ یہ وہ مسلسل کہتی گئی "اگر میں یہ جانتی کہ میں زندہ رہوں گی اور پھر ایک نوجوان لڑکی بن جاؤں گی تو میں شرمندہ بھی ہوتی۔۔۔ واقعی شرمندہ۔۔۔ مگر اس حالت میں اس کی کیا ضرورت ہے؟" "لیکن یہ کس نے کہا کہ تم مر جاؤ گی؟" "اب چھوڑو بھی اسے! تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ تم جھوٹ بولنا نہیں جانتے! ذرا اپنی صورت تو دیکھو!"۔۔۔ "اینڈریونا تم زندہ رہو گی۔ میں تمہارا علاج کروں گا۔ اور ہم دونوں ایک ہو جائیں گے۔۔۔۔ اور پھر ہنسی خوشی اپنی زندگی گزاریں گے۔" "نہیں۔ نہیں۔ مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔ میں یقیناً مروں گی۔۔۔ تم نے وعدہ کیا ہے۔۔۔ تم نے کہا ہے"۔۔۔ میرے لئے یہ بات بہت تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔ خیال تو کیجئے کہ بعض وقت معمولی باتوں سے کیا ہو جاتا ہے۔ بظاہر معاملہ کچھ نہیں مگر ہے بہت اہم۔ اُس کے دل میں یکایک کچھ خیال آیا اور میرا نام دریافت کرنے لگی۔ میرا خاندانی نام نہیں بلکہ پہلا نام۔ میرا نام ٹرائفن بہت برا تھا مگر اب اسے کیا کروں۔ نام ہی ٹرائفن ہے۔ گھر میں البتہ سب لوگ مجھے ڈاکٹر کہا کرتے تھے بہر حال میں نے اُس سے کہا کہ میرا نام ٹرائفن ہے۔ یہ سنکر اُس نے اپنا سر ہلایا اور فرانسیسی زبان میں کچھ کہا جو میرے خیال میں کوئی اچھی بات نہ ہو گی۔ اسکے بعد وہ ہنسنے لگی۔ قصہ مختصر میں نے وہ تمام رات اُس کے ساتھ اسی طرح بسر کی۔ صبح ہونے سے قبل میں باہر چلا گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ چائے کے بعد میں اُسکے کمرہ میں پھر گیا مگر اب اُسکی یہ حالت ہو گئی تھی کہ میں بہ مشکل اُسے پہچان سکتا تھا۔ جن لاشوں کو قبر میں اُتارا جاتا ہے وہ بھی اس سے اچھی حالت میں ہوتی ہیں۔ میں آپ سے قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں مطلق نہیں سمجھ سکتا کہ میں اس نظارہ کو کیونکر برداشت کر سکا۔ بہر حال تین دن اور تین رات میری مریضہ اور زندہ رہی۔ مگر معاذ اللہ! کیا راتیں تھیں! نہ معلوم اُس نے مجھ سے کیا کیا باتیں کیں۔ آخری رات میں ۔ ذرا خیال کیجئے ـــــ میں اُس کے پاس بیٹھا ہوا خدا سے صرف ایک دعا مانگ رہا تھا کہ اے خدا اسے جلدی سے اُٹھا لے اور

اس کے ساتھ ہی مجھے بھی !" میں یہ دعا مانگ ہی رہا تھا کہ اینڈریونا کی بڈھی ماں یکایک کمرہ میں خلاف توقع داخل ہوگئی۔ میں نے شام ہی کو اُس سے یہ کہہ دیا تھا کہ اینڈریونا کے بچنے کی اُمید کم ہے اس لئے بہتر ہوگا کہ وہ کسی پادری کو بلالے۔ لیکن بیمار لڑکی نے اپنی ماں کو دیکھتے ہی کہا " اچھا ہوا کہ آپ آگئیں۔ ہماری طرف دیکھئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ہم لوگوں نے ایک دوسرے کو اپنا قول دیا ہے "۔ " ڈاکٹر صاحب! یہ کیا کہہ رہی ہے ؟" میں نے جواب دیا " بخار ہے۔ ہذیان بک رہی ہیں "۔ لیکن میرے یہ کہتے ہی اینڈریونا بول اُٹھی " ہائیں تم نے ابھی تو کچھ اور کہا تھا میری انگوٹھی بھی تم لے چکے ہو۔ تم بنتے کیوں ہو میری ماں بڑی نیک ہے۔ وہ معاف کردیں گی۔ وہ سمجھ جائیں گی۔ اور میں تو مر ہی رہی ہوں ... مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اپنا ہاتھ دو "۔ مگر میں یہ سنتے ہی کمرہ سے بھاگا اور بڈھی عورت سمجھ گئی کہ قصہ کیا ہے۔

" میں آپ کی اور زیادہ سمع خراشی نہ کروں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کی یاد خود میرے لئے بڑی تکلیف دہ ہے۔ میری مریضہ کا دوسرے دن انتقال ہوگیا۔ خدا اُس کی روح کو آرام دے "۔ " مرنے سے قبل " ڈاکٹر نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا " اُس نے اپنے گھر بھر سے کہا کہ سب لوگ باہر چلے جائیں اور مجھے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اکیلا رہنے دیں۔ جب سب لوگ چلے گئے تو اُس نے مجھ سے یوں کہنا شروع کیا " مجھے معاف کردو۔ تمہارے لئے موردِ الزام میں ہی ہوں ... میری بیماری ... لیکن یقین کرو کہ میں نے تم سے زیادہ اور کسی سے نہیں محبت کی ... مجھے بھولنا نہیں ... میری انگوٹھی رکھے رہو "۔ یہ کہکر ڈاکٹر چلنے کے لئے تیار ہوا مگر میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

" اچھا " وہ بولا " آیئے ہم لوگ معمولی سی شرط پر " پریفرنس " کھیلیں۔ مجھ ایسے آدمیوں کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ جذبات کے آگے سرنگوں ہو جائیں۔ مجھے تو صرف ایک بات کا خیال رکھنا ہے اور وہ یہ کہ بچوں کو رونے سے کیسے خاموش کیا جائے اور بیوی کی ڈانٹ سے کیسے بچا جائے۔ اُس واقعہ کے بعد میں نے ایک قانونی شادی کرلی۔ میں نے ایک تاجر کی لڑکی سے نکاح کرلیا۔ سات ہزار اُس کے جہیز میں ملے اُس کا نام اکولین ہے۔ " ٹرائفن " کے نام کے ساتھ یہ نام بہت موزوں ہے۔ اُس کا مزاج بہت خراب ہے مگر خوش قسمتی سے وہ دن بھر سویا کرتی ہے ... ہاں تو یہ بتایئے کہ " پریفرنس " کھیلئے گا ؟"

ہم لوگ نصف پنی فی پوائنٹ کے حساب سے " پریفرنس " کھیلنے لگے۔ اور کچھ دیر بعد ٹرائفن آئیوچ مجھ سے ڈھائی روبل جیت کر، اپنی کامیابی پر مسرور، کافی رات گئے اپنے گھر چلا گیا۔

(ٹرگینو)

ضیاء بدایونی اور مومن

ہماری قدیم شاعری کے آخری دور میں ذوق، غالب اور مومن وہ باکمال شعراء ہوئے ہیں جنکو زمانہ شاید کبھی نہیں مٹا سکتا اور حقیقت یہ ہے کہ سلاستِ بیان، بلندیٔ فکر اور رنگینیٔ خیال کے جو نادر نقوش وہ چھوڑ گئے ہیں وہ آپ اپنی نظیر ہیں۔

ذوق مرحوم کا کلام عام فہم تھا، ہمارے ہی عہد میں باآب و تاب سوانح کے ساتھ شایع ہو گیا۔ غالب کا کلام۔ دقت و نزاکتِ فکر میں بے نظیر تھا، اُن کے دیوان پر پہلی افتاد مولانا خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ کرم تھی۔ حیرت ہے حضرت مولانا نے دفترِ فلسفہ کیوں دریا برد کر دیا، آخر اُن کے بعد کون فلسفہ کا امام پیدا ہونے والا تھا؟

غالب اگرچہ "گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل" کی مصیبت میں گرفتار ہو گئے تاہم کہہ گزرے کہ:۔

"ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو" آسماں نے یقیناً خوب دستورِ صلح جوئی سے کام لیا کہ غالب کے باقیماندہ کلام کی طرف اہل ملک کی توجہ منعطف ہوئی اور "قیمتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن" کی پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ہو گئی، اب رہے حضرت مومن سو غدر ۵۷ھ کے بعد گوناگوں مصائب نے ہندوستان کو اس قابل نہ رکھا کہ کوئی بات لطف و اطمینان کی ہو سکتی، آخر کار ایک مدت کے بعد آج مومن کا کلام اپنی پوری جامہ زیبی کے ساتھ عالم شہود میں جلوہ گر ہے۔

ہمارے محترم جناب مولنا ضیاء احمد صاحب کا وجود نہ صرف بدایوں بلکہ ملک کے لئے سرمایہ صد فخر و مباہات ہے۔ آپ کی سعی جمیل سے مومن کے دیوان کا یہ نسخہ معہ شرح کے ہمارے پیش نظر ہے، اس میں شک نہیں کہ مومن کے کلام کے ساتھ جو بے اعتنائی برتی گئی اس کی تلافی مولانا نے فرمائی اور دقیق ترین اشعار کے معانی مولانا نے بحسن و خوبی واضح فرما دئے، اب جو سخن شناس آیندہ مومن کے کلام پر توجہ کرے گا۔ اس کے لئے مولانا کی شرح راہنما ہو گی اور "الفضل للمتقدم" کا شرف مولنا کے لئے مخصوص رہیگا۔

مقدمہ پر ایک سرسری نظر سے معلوم ہوا کہ مولانا محبِ مفرط ہیں، اگر ہمیں متعصبانِ مفرط میں قیاس

نہ کیا جائے تو اسقدر عرض کرنا ہے کہ افضلیت یا کم از کم "افضلیت من کل الوجوہ" سے مولنا کو احتراز ضروری تھا، مولانا فرماتے ہیں "ذوق و غالب مقلد ہیں اور مومن مجتہد" یہ مولنا کا اجتہاد ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے "قصیدہ نگاری میں بجز سودا مومن کا کوئی ہمسر نہیں" اگر ایسا ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد لیکن یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی کہ "اگرچہ پختگی" اور صفائی میں ذوق کا پایہ کہیں برتر ہے تاہم زور اور ندرت میں مومن کا جواب نہیں" اگر زور کے مفہوم میں پختگی اور صفائی بھی شامل ہے تو ماننا پڑے گا کہ ذوق کا مثل قصیدہ نگار، شعراء اردو میں پیدا نہیں ہوا

مولنا فرماتے ہیں "غزل میں تصوف عجز شاعرانہ ہے"[۱] تاہم آپ کی رائے ہے کہ ایک صوفی صافی طبیعت غزل سرائی کے لئے رند شاہد باز بنے تو غزل کہے ورنہ قدرت کلام سے محروم قرار پائے۔ حالانکہ حضرت مومن کی پہلی غزل حمد و نعت وغیرہ پر مشتمل ہے۔ گو علمیت کا جلوہ غزل میں بھی موجود ہے ؎

آتش سینہ تفسیدہ کو کیا میں روؤں　　اشک جانب کرہ آب کے مایل نہوا

بہرحال ہمیں مولنا سے اسقدر عرض کرنے کا حق حاصل ہے، کہ مومن کی تعریف دوسروں کی تنقیص کی مستلزم نہ تھی۔ مولنا ذوق کی نسبت فرماتے ہیں ملخصاً "ذوق کی تمام عمر لابہ گری و بادخوانی میں بسر ہوئی غلامانہ ذہنیت ایسے ہی نتائج پیدا کرتی ہے،" مومن کی بابتہ ارشاد ہے "نعت و منقبت کے علاوہ صرف دو قصیدے ہیں جو ارباب دنیا کی مدح میں کہے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو نواب وزیر الدولہ نواب ٹونک کی شان میں (جن سے مومن کو روحانی نسبت بھی تھی) دوسرا راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ مقیم دہلی کے شکریہ میں جنھوں نے اُن کو خود بلا کر انعام و اکرام سے سرفراز کیا تھا" ابو ظفر بہادر شاہ جو سلاطین مغلیہ میں تنہا درویش بادشاہ ہوا ہے راجہ اجیت سنگھ کے برابر بھی مستحق ستایش نہ تھا۔

مقدمہ کے بعد دیوان معہ شرح ہے۔ اور اس حقیقت کا اظہار غالباً نازیبا نہ ہوگا کہ درس گاہ دنیا کی یہ ستم ظریفی بیحد دلچسپ ہے کہ ایک مضمون تعلیم کیا جاتا ہے۔ دوسرے میں امتحان لیا جاتا ہے۔ مولنا کا کورس تھا لنترو ہدایہ یا مجموعۂ دل، اور امتحان ہوا دیوان مومن میں ــــ بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

مومن کی پہلی غزل کا ایک شعر ہے :-

مجھے وہ تیغ جوہر کر کہ میرے نام سے خون ہو　　دل صد پارہ اصحاب نفاق و اہل بدعت کا

---

[۱] (نگار) تصوف کے مسایل مفروضہ کا ذکر غزل میں سوائے اس کے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ شاعر جذبات عشق سے بالکل بیگانہ ہو اور مومن کی طرف سے کبھی اس کمزوری کا اظہار نہیں ہوا۔ اگر ابتدار دیوان میں کوئی غزل اسکی حمد و نعت میں پائی جاتی ہے تو وہ بالکل رسمی چیز ہے اور اس کو معارضہ کی دلیل نہیں بنا سکتے۔

مولانا شرح میں فرماتے ہیں کہ :-

"تیغ جوہر — وہ حسن کے جوہر تیغ کی طرح ہوں - اصلی تلوار یا آئینہ میں جو نشان ہوتے ہیں اُن کو جوہر کہتے ہیں - خاصیت کے معنی میں بھی آتا ہے "

میری ناقص رائے میں جوہر سے یہاں مراد کمال ہے / تیغ جوہر استعارہ ہے اور کہنا یہ مقصود ہے کہ میرا کمال دیکھ کر اہل بدعت و ضلال کا دل خون ہو جائے -

---

ایک اور غزل کا شعر ہے :-

حیرتِ حسن نے دیوانہ کیا گر اس کو　　دیکھنا خانۂ آئینہ بھی ویراں ہوگا

شرح :- "خانۂ آئینہ کی ویرانی سے اُس کی بے رونقی مراد ہے - اس کو یعنی معشوق کو آئینہ دیکھتے وقت اگر خود اُسکے حیرتِ حسن نے دیوانہ کر دیا - تو پھر آرائش سے بیزار ہو جائے گا "

میں حاصل شرح کچھ نہ سمجھا - شعر میں دو نازک تخئیل ہیں - ایک یہ کہ محبوب کا حسن جنوں زا ہے - دوسرے آئینہ پر رشک ہے کہ وہ جلوۂ حسن سے کامیاب ہے لہذا اگر محبوب حیرتِ حسن سے دیوانہ ہو گیا تو پھر آئینہ دیکھنا معلوم - آئینہ یقیناً خانہ ویراں ہوگا -[۵]

مومن کا ایک شعر ہے :-

مجمعِ بسترِ مخمل شبِ غم یاد آیا　　طالعِ خفتہ کا کیا خواب پریشاں ہوگا

شرح :- "شبِ ہجراں میں کامرانی وصل یاد آئی / جب بستر مخمل پر دوست کے ساتھ دادِ عیش دے رہے تھے ایسی حالت میں یادِ عیش گزشتہ سے سوئے ہوئے نصیب کا خواب کسقدر پریشاں ہوگا - یعنی یادِ وصل، خفتہ طالعی کی تلخی میں اور اضافہ کرے گی - لفظ خواب میں ایہام ہے "

یادِ وصل، خفتہ طالعی کی تلخی میں ضرور اضافہ کرتی ہے - لیکن یہ معنی پیدا کیونکر ہوئے، خوابِ مخمل، مخمل کے روئیں کی ہمواری کا نام ہے - اور اس خواب کی پریشانی اُس کا حرکت یا مس سے ناہموار ہو جانا ہے - شبِ غم وہ وقت یاد آ گیا - جب بسترِ مخمل پر دادِ نشاط دے رہے تھے - مخمل کا خواب پریشاں یاد آیا -

---

۵ - (نگار) میں نہیں سمجھ سکا کہ شارح کے مفہوم سے ہٹ کر آپ نے کونسا دوسرا مفہوم پیدا کیا - جو آپ کہتے ہیں وہی شارح بھی سمجھا ہے - آپ نے آئینہ پر رشک کرنے کا جو مفہوم پیدا کیا ہے وہ بے محل ہے اور شعر سے ظاہر نہیں ہوتا -

کیا طالع خفتہ کا خواب اس یاد سے پریشان ہو سکتا ہے۔ استفہام انکاری یعنی ہماری خفتہ بختی اب کیا ختم ہو گی۔ [لہ]

مومن:۔ پان میں یہ رنگ کہاں آپ نے آپ مرے خون کا دعویٰ کیا،

شارح:۔ "یہ رنگ پان نہیں بلکہ سرخیٔ خونِ عاشق ہے۔ آپ نے پان کھا کر اپنے اوپر قتل کا الزام لے لیا۔"

شاعر نے یہ نہ کہا تھا کہ آپ میرا خون پی گئے ہیں۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ میرے خون کا دعویٰ ہی میرے خون کی نسبت سے رنگین ہے [کہ]

مومن:۔ جائے تھی تیری مرے دل میں سو ہے غیر سے کیوں شکوہ بیجا کیا

شارح:۔ "یعنی غیر کے دل میں تیری جگہ پہلے ہی کب تھی۔"

مطلب صاف ہے۔ عاشق کہتا ہے آپ نے غیر سے ہمارا شکوہ ناحق کیا حالانکہ ہمارے دل میں آپ کی جگہ بدستور باقی ہے۔

مومن:۔ رحم فلک اور مرے حال پر تو نے کرم اے ستم آرا کیا

شارح:۔ "تو نے مجھ پر اسقدر ظلم کئے کہ اب آسمان کو بھی میرے حال پر رحم آنے لگا۔"

فلک سے رحم مستبعد ہے خصوصاً مجھ پر۔ مگر اے ستم آرا تیرے کرم نے [سہ] میرا یہ حال کیا کہ فلک کو بھی مجھ پر رحم آئے ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔

مومن:۔ امیدِ وعدۂ دیدار حشر پر مومن یہ ہے مزا تھا کہ حسرت کشِ بتاں نہوا

شارح:۔ "مومن اسقدر بدذاق تھا کہ امیدِ وعدۂ دیدار پر بیٹھا رہا اور بتوں کی تمنا نہ کی یعنی نقد کو چھوڑ کر نسیہ کو اختیار کیا۔"

لہ (نگار) مقالہ نگار کو لفظ "کیا" کے مفہوم سے اختلاف ہے۔ شارح نے اس کا مفہوم "کسقدر" بتایا ہے اور معترض اس کو استفہام انکاری بتاتے ہیں اور "پریشان خوابی" کے معنی "بیداری" ظاہر کرتے ہیں۔ میرے نزدیک لفظ کیا مومن نے یہاں "کیا کیا" کی جگہ استعمال کیا ہے اور شارح نے مفہوم صحیح سمجھا ہے۔ — کہ (نگار) اعتراض میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ نہ رنگ پان سے یہاں "خون بہا" مراد ہے اور نہ واقعی "رنگ پان" بلکہ مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ میرے قتل کے بعد آپ کی یہ آرائش و مسرت خود اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ آپ نے مجھے قتل کیا ہے۔
سہ (نگار) شارح کا مطلب صحیح ہے۔ مومن کا مقصود یہاں اس ستم کا اظہار نہیں جو کرم کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

حشر تک وعدۂ دیدار کی امید، حشر تک مبتلائے حسرت رہنا ہے۔ اس امید سے مومن اس قدر بے مزہ تھا کہ بتوں کی محبت میں حسرت کش نہ بن سکا۔[1]

مومن :۔ کچھ اپنے ہی نصیب کی خوبی تھی بعد مرگ ہنگامۂ محبت اغیار کم ہوا

شارح :۔ "یعنی اگر میری زندگی میں رقیبوں کی محبت کا ہنگامہ کم ہوتا تو میں رشک سے کاہے کو مرتا"

شعر سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہے کہ رشک سے مرگیا ہنگامۂ محبت اغیار ہماری بدنصیبی کی بدولت تھا۔ ہم نہ رہے تو وہ ہنگامہ نہ رہا۔[2]

مومن :۔ ناکامیوں کی کاہشِ بے حد کا کیا علاج بوسہ دیا تو ذوقِ لبِ یار کم ہوا

شارح :۔ "مومن ناکامیوں کے مصائب کا شکوہ سنج ہے یعنی پہلے تو حسرتِ بوسہ کی کاہش تھی۔ جب بوسہ ملا تو لبِ یار میں وہ لذت باقی نہ رہی۔ غرض دونوں طرح ناکامی ہے۔ قاعدہ ہے کہ حصول شے کے بعد اس شے میں پہلی سی کشش باقی نہیں رہتی۔"

میرے خیال میں شرح کسی قدر بعید الفہم ہے اور لبِ یار میں لذت باقی نہ رہنا بھی شعر سے ظاہر نہیں ہوتا۔ حصولِ نعمت کے بعد نعمت کی قدر کم بھی ہوجاتی ہے۔ اور بڑھ بھی جاتی ہے۔ یہ شوق کی بیشی و کمی پر منحصر ہے۔ شاعر کہتا ہے۔ ناکامی کی کاہش حد سے تجاوز کرکے لاعلاج ہوگئی۔ محبوب نے بوسہ دیا تھا تو چاہئے تھا کہ اس کامیابی سے شوق ترقی کرتا۔ لیکن پیہم ناکامیوں نے یہ عالم کردیا ہے کہ آیندہ کی امید ہی قائم نہیں ہوتی اور ایک بوسہ ملنے پر ہمارے ذوق میں کمی آگئی۔[3]

---

[1] (نگار) شارح نے یقیناً اس شعر کا مفہوم نہیں سمجھا۔ "بے مزہ" کے معنی "بدمزاق" قرار دینا خوش ذوقی کے خلاف ہے "بے مزہ ہونا" کا مفہوم "مکدر ہوجانا" ہے۔

[2] (نگار) مقالہ نگار اس شعر کا مفہوم صحیح سمجھے ہیں۔ مومن نے "نصیب کی خوبی"، "بدنصیبی" کے معنے میں استعمال کی ہے اور شعر کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بھی میری بدنصیبی تھی کہ جب تک میں زندہ رہا ہنگامۂ اغیار بھی رہا اور اب کہ میں مرگیا ہوں تو اس میں بھی کمی پیدا ہوگئی۔ حالانکہ یہ بات ایسی ہے جو میری ہی زندگی میں ہونی چاہئے تھی۔

[3] (نگار) شارح و معترض دونوں ایک ہی نتیجہ پر پہونچے ہیں صرف الفاظ کا فرق ہے۔ "ذوقِ لبِ یار" میں لفظ "ذوق" کو محبوب کے لبوں سے متعلق کرکے انھیں خالی از لذت بتانا تہذیبِ عاشقی کے خلاف ہے۔ اس لئے "ذوق" کا تعلق خود شاعر کے شوق سے ہے۔ یعنی ہمیں میں وہ ذوق باقی نہ رہا کہ "لبِ یار" سے لذت کش ہوتے۔

مومن :۔ عبث اُلفت بڑھی تمکو وہ کب دیتا تھا دم تم پر — یہ مجھکو دیکھ کر دشمن کلیجہ تھام لیتا تھا

شارح :۔ "کلیجہ تھام لینے کا سبب تمہاری محبت کا اظہار نہ تھا بلکہ میرے حالِ زار پر اظہارِ تاسف۔ یعنی میری حالت پر رقیب کو بھی رحم آتا تھا"

دشمن کا عاشق پر رحم کھانا سمجھ میں نہیں آتا۔ کلیجہ تھام لینا دردِ عشق کی بدولت نہ تھا بلکہ رشک و حسد سے تھا کہ مومن اس بزم میں کیوں موجود ہے۔[1]

مومن :۔ کرۂ خاک ہے گردش میں طپش سے میری — میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

شارح :۔ "مجھے حالتِ اسیری میں بھی آزادی میسر ہے اس واسطے کہ جب میں زنداں میں تڑپتا ہوں تو میری طپش کے اثر سے تمام کرۂ زمین گردش کرنے لگتا ہے اور اس کے ساتھ میں بھی گردش کرتا ہوں۔ اب آزادی کے لئے اور کیا چاہئے"

یہاں شاعر نے تمام روئے زمین کو اپنے لئے زنداں کہا ہے۔ مولانا نے ایک مخصوص قید خانہ قیاس کیا ہے اور آزادی یہ بتائی کہ زمین کے ساتھ میں بھی گردش کرتا ہوں کرہ کے ساتھ ہر چیز گردش کرتی ہے۔ مگر وہ گردش اختیاری کہاں ہے جس کو آزادی کہا جائے۔ شعر میں جو حسن تھا وہ شرح کی نذر ہو گیا۔ طپش کو گردش زمین کی علت قرار دینا اور کل کرۂ ارضی کو اپنے لئے زنداں کہنا۔ نہایت لطیف بات ہے جس کی طرف شارح نے توجہ نہیں کی۔[2]

مومن :۔ لذت جور سے دم لینے کی فرصت نہ رہی — کیا اثر منتظرِ دعوتِ فریاد رہا

شارح :۔ "اثر کسقدر میری فریاد کی دعوت کا منتظر رہا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ میں نے فریاد ہی نہیں کی اور ستم یار کی لذت میں اتنا محو رہا کہ دم لینے کی مہلت نہ ملی"

'کیا' اگر تکرار ہو تو 'کسقدر' کے معنی دے سکتا ہے۔ مصرع ثانی میں استفہام انکاری ہے یعنی اثر منتظر دعوت فریاد نہ رہا۔ گو میں نے فریاد نہ کی لیکن اثر ظاہر ہے کہ بیدادِ دوست سے دم لینے کی بھی فرصت نہ ہوئی[3]

مومن :۔ دلبروں میں بیوفا میری وفا کی دھوم ہے — بوالہوس سے کیوں کہا تھا راز جو افشا کیا

---

[1] (نگار) کلیجہ تھامنے کا مفہوم اردو میں صرف ایک ہی ہے یعنی تاثرِ غم و الم سے بیتاب ہو جانا۔ اور رشک و حسد سے اسے کوئی واسطہ نہیں

[2] (نگار) مقالہ نگار کی توجیہ یقیناً زیادہ لطیف ہے۔

[3] (نگار) شارح نے مفہوم صحیح سمجھا ہے۔ اگر فریاد کا مقصود "دعوتِ ستم" ہوا کرتا تو مقالہ نگار کی توجیہ قابلِ قبول ہو سکتی تھی۔

شارح ۔ "معشوق کو یہ گوارا نہیں کہ حسینوں میں عاشق کی وفا کی تعریف ہو۔ اس کی اس ذہنیت سے عاشق یوں
فایدہ اٹھاتا ہے کہ تم نے رقیب سے میرا راز محبت کیوں کہدیا۔ جو افشا ہوگیا۔ اور حسینوں میں چرچا ہونے لگا
کہ مومن انتہا کا وفا پرست ہے ۔ جو ایسے ظالم سے عہد وفا نبا ہتا ہے ۔ اس اشتعال کا نتیجہ لامحالہ یہ ہوگا کہ
آیندہ رقیب سے وہ راز ظاہر نہ کرے گا۔ جس میں مومن کا سراسر فایدہ ہے"

محبوب کو بیوفا کہا گیا جو بوالہوس رقیب سے ملتا ہے۔ محبوب یا تو دل سے مومن کی محبت کا قایل ہے۔ یا بوالہوس کی محبت اور ابھارنے کے لئے اس نے مومن کی محبت کا تذکرہ کیا۔ بات عالم آشکارا ہوگئی۔
اب شعر سے دو مدعا حاصل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ محبوب کے یہ ذہن نشین ہو کہ رقیب ملنے کے قابل نہیں، دوسرے یہ کہ دلبروں میں مومن کی وفا مشہور ہو جانے سے اس کو یہ خیال پیدا ہو کہ مومن ہاتھ سے دینے کی چیز نہیں [۱]۔

مومن :۔ کیا خجل ہوں اب علاج بیقراری کیا کروں دھر دیا ہاتھ اُسنے دل پہ تو بھی دل دھڑکا کیا
شارح :۔ "پہلے تو دل اضطراب کی وجہ سے دھڑکتا تھا۔ اب جوش مسرت کے باعث دھڑکنے لگا"

اضطراب اور دھڑکنا تو ایک ہی چیز ہے۔ پھر اضطراب کی وجہ قرار دینا کیا معنی۔ شعر کا لطف "کیا خجل ہوں" کی شرح میں ہے۔ یعنی محبوب کو یہ باور کرایا تھا کہ اضطراب دل کا سبب تمہاری جدائی ہے۔ اُس نے دل پر ہاتھ رکھدیا۔ مگر دل جوش مسرت سے پھر بھی دھڑکتا ہی رہا۔ شرمندہ ہوں۔ یوں کہ وہ سمجھیں گے کہ بیان غلط تھا۔ درحقیقت مجھسے ملنا وجہ قرار نہیں۔ مضطرب ہوں کیا کروں کہ یہ حرکت قلب بند ہو اور اُن کو میری بات میری محبت کا اعتماد ہو [۲]۔

مومن :۔ محشر میں پاس کیوں دم فریاد آگیا۔ رحم اُس نے کب کیا تھا کہ اب یاد آگیا
شارح :۔ "محشر میں عاشق فریاد کرنے والا تھا کہ پاس معشوق سے رک گیا۔ اب اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ معشوق
نے دنیا میں کبھی رحم کیا ہوتا۔ تو وہ رحم اس وقت یاد آکر مانع فریاد ہوتا۔ مگر جب ہمیشہ ظلم ہی کئے تو فریاد سے
باز رہنے کی کیا وجہ"

---

[۱] (نگار) مقالہ نگار نے خواہ مخواہ کھینچ تان سے کام لیا، حالانکہ اس صورت میں بھی مفہوم وہی رہا جو شارح نے بیان کیا ہے۔
[۲] (نگار) شارح کا مقصود بھی وہی ہے جو معترض کا۔ اگر شارح اضطراب کے بعد "جدائی" کا لفظ بڑھا دیتے تو معترض کو کچھ کہنے کا موقعہ نہ ملتا۔

یہاں مولانا نے لفظ "پاس" "لحاظ" کے معنی میں قیاس کیا ہے حالانکہ کوئی قرینہ اس کا نہ تھا جس سے شعر کے معنی بے لطف ہوگئے معشوق کا لحاظ کر کے ہمیں محشر میں فریاد سے باز رہنا مناسب نہ تھا۔ میرے نزدیک اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ محشر میں وہ دم فریاد میرے پاس کیوں آگیا۔ کیا اُسے فریاد پر رحم آیا۔ رحم اُس نے کب کیا تھا کہ اب یاد آیا۔ پاس آنے کی غرض کچھ اور ہے یعنی زبان بندی۔[لہ]

مومن :۔ دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب　　　تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

شارح :۔ "منجم نے شاعر کا حال زار دیکھا۔ اور تاثیر نجوم کے حساب سے اُس کی ناکامی عشق کا پتہ لگالیا۔ اور خود اُس کا رقیب بن بیٹھا کیونکہ عاشق کی ناکامی دریافت کر کے اُس کو اپنی کامرانی کی توقعات پیدا ہوئیں۔ اس طریقہ سے میرا طالع ناساز دیکھنا منجم کے حق میں سازگار ہوگیا۔"

میرے نزدیک یہاں رقیب مبتدا مؤخر تھا سازگاری طالع یہ ہے کہ رقیب نے نجوم سیکھا تو اُس کو یہ راز معلوم ہوا کہ وہ کسی کے دوست ہو نہیں سکتے۔[سلہ]

مومن :۔ ستم ہے شدت گریہ سرایت خوں نے کی پر کی　　　رکھے رومال چشم خوں فشاں پر لاکھ تہ تہ کر

شارح :۔ "میرے گریہ خونیں کی شدت غضب کی ہے۔ جس کی وجہ سے خون رومال کی تہوں میں سرایت کر گیا "کی پر کی" میں تکرار تاکید کی غرض سے ہے۔"

مصرعہ اول میرے نزدیک یوں ہے۔ "ستم اے شدت گریہ سرایت تو نے کی پر کی" چشم خوں فشاں دوسرے مصرعہ میں ہے۔ لفظ خوں پہلے مصرعہ میں غیر ضروری ہے۔ ضمیر خطاب آنا ضروری۔ اب شرح دیکھئے تغزل یا عشق دونوں کا وجود نہ رہا۔ کہنا یہ ہے کہ اخفائے غم عشق مقصود ہے اور شدتِ گریہ کا ستم یہ ہے۔ کہ باوجود پردہ داری راز افشا کرتی ہے۔ خواہ اُن کی بزم میں ہوں یا کہیں اور۔[سلہ]

مومن :۔ ہے سرخ ٹپکا اور خون غیر میں رنگا ہوا　　　کیا قتل پر میرے کمر نکلے ہو گھر سے باندھکر

لہ (نگار) معترض کا مفہوم صحیح نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں مصرعۂ ثانی کی ردیف کوئی معنی پیدا نہیں کرتی۔ شارح نے مطلب ٹھیک سمجھا ہے۔

سلہ (نگار) شارح نے مطلب ٹھیک بیان کیا ہے۔

سلہ (نگار) معترض کی اصلاح و توجیہ دونوں بے محل ہیں۔ مطلب بالکل واضح ہے اور شارح نے اسے بالکل صحیح سمجھا ہے۔

شارح :- "یہ سب میرے قتل کا سامان ہے۔ کیونکہ میں جذبہ رشک سے ہلاک ہو جاؤں گا۔ پٹکا کمر میں ہوتا ہے۔ اسلئے مصرع ثانی کے محاورے (کمر باندھکر نکلے ہو) نے لطف پیدا کر دیا۔"

سرخ پٹکا آرائش ہے۔ ادائے معشوقانہ ہو۔ لیکن ترکانہ ادا نہیں۔ جو قتل سے مناسبت تامہ رکھے[1]۔ وہ بھی خون غیر سے رنگا ہوا۔ اس ادا سے تم میرے قتل پر کمربستہ ہو؟ — "کیا" استعجاب بلکہ استحقار کا فائدہ دیتا ہے یعنی جاؤ بھی تمھیں عاشق کا قتل کرنا بھی نہیں آتا۔ یوں ہی معشوق بنے ہو۔[2]

مومن :- پایا جو دشمنوں نے ترے پاس اعتبار　　آنکھیں چراتے ہیں مجھے احباب دیکھکر

شارح :- "احباب مجھ سے اس لئے آنکھیں چراتے اور اغماض کرتے ہیں کہ میں تیری نگاہوں میں حقیر ہو گیا ہوں۔"

میرے نزدیک شاعر کا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ تم نے جو میرے دشمنوں سے ارتباط بڑھایا تو میرے دوست مجھ سے بھی بدظن ہو گئے۔ کہ شاید یہ بھی ایسی پست فطرت کا ہو گا ورنہ وہاں کیوں جاتا۔ ارتباط غیر پر انتہائی سرزنش ہے۔ اور نہایت لطیف انداز میں۔[3]

مومن :- یہ تشنہ کامی نگہ گرم دیکھنا　　حسرت سے رو دیا طرف آب دیکھکر

شارح :- "میرا دل محبوب کی نگہ گرم (نظر عتاب) کے اثر سے جلنے لگا اور اس جلن نے اس قدر تشنگی پیدا کر دی۔ کہ میں پانی کو دیکھکر حسرت سے رو دیا۔ حسرت کی وجہ یہ ہے کہ یہ پیاس پانی سے بجھنے والی نہیں۔"

نگہ گرم۔ نگہ عتاب ہی کو نہیں کہتے التفات آمیز نگاہ پیہم بھی گرم کہی جا سکتی ہے۔ خیر نگہ گرم کو نگاہ عتاب کہنے میں بھی چنداں مضائقہ نہ تھا۔ عاشق نگہ عتاب کا بھی آرزومند ہو سکتا ہے کہ آخر نگاہ تو ہے۔ قیامت یہ ہو کہ شاعر اپنے آپ کو نگہ گرم سے محروم نگہ گرم کا آرزومند کہتا ہے۔ اور شارح نے یہ فرمایا کہ نگاہ گرم نے وہ جلن پیدا کی کہ تشنگی (بمعنی حقیقی) پیدا ہو گئی اس قدر الفاظ شاعرانہ ضرور ہیں کہ پیاس پانی سے بجھنے والی نہیں، لیکن جب تشنگی حقیقی پیاس کے معنے میں ہے تو کیوں نہ بجھے گی۔ استسقا تو نہیں؟ معنی صرف یہ تھے

---

[1] (نگار) خاص مناسبت رکھتی ہے۔

[2] (نگار) "کیا" کا مفہوم معترض نے صحیح سمجھا ہے۔

[3] (نگار) معترض نے جو مفہوم بیان کیا ہے وہی زیادہ قرین قیاس ہے۔

کہ ہم تشنہ کام نگہ گرم کے آرزومند تھے، پانی نظر آیا۔ کہ عوام الناس کی تشنگی رفع کرتا ہے۔ حسرت ہوئی کہ ہماری تشنگی کا کوئی مداوا نہیں[1]۔

مومن :- توبہ کہاں کدورت باطن کے ہوش تھے — غش ہوگیا میں رنگ مئے ناب دیکھکر

شارح :- "توبہ مجھے اسقدر ہوش کہاں رہے۔ کہ شراب ناب کی باطنی کدورت پر نظر کرتا میں تو اُسکا رنگ دیکھتے ہی غش ہوگیا۔ باطنی کدورت سے شراب کی تلچھٹ وغیرہ بھی مراد ہوسکتی ہے اور اُسکی اخلاقی مضرت بھی"

باطن سے اپنا باطن مراد ہے نہ کہ شراب کا۔ توبہ مجھے یہ ہوش کہاں تھے کہ میکشی کا نتیجہ خرابیِ باطن جانتا۔ میں تو وہ مے پرست ہوں۔ کہ رنگ مے ناب پر غش ہوگیا[2]۔

مومن :- مومن یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ہو — کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھکر

شارح :- "اہلِ دین کو یہ تاب نہیں کہ تقاضائے جلوۂ دوست (معشوق حقیقی) کرسکیں اور اگر کوئی جناب کلیم کی طرح تقاضائے ارنی کر بیٹھتا ہے۔ تو اُسے جواب میں لن ترانی سننا پڑتا ہے۔ دین میں یہ پابندی آداب دیکھکر میں کافر ہوگیا کہ بتوں کے یہاں یہ قیود تو نہیں"

یہاں مولانا "نقلِ کفر۔ کفر نہ باشد" کا اصول فراموش کرگئے۔ شاعر نے تو یہ کہا تھا۔ کہ دین میں تقاضائے جلوہ ممکن[3] ہے اور وہ میرے نزدیک ادب عشق کے خلاف ہے۔ میں دین کا یہ آداب دیکھکر کافر ہوگیا۔

مومن :- بے مروت ناتواں ہیں ہنس دے روتا دیکھکر — دل دیا میں نے اُسے کیا جانئے کیا دیکھکر

---

[1] (نگار) اس شعر میں غور طلب امر یہ ہے کہ "تشنہ کامی نگہ گرم" کی ترکیب اضافی کیسی ہے۔ یعنی مومن کی مراد وہ "تشنہ کامی" ہے جو نگہ گرم" کے عدم حصول سے وابستہ ہے۔ اگر پہلا مفہوم لیا جائے تو شعر بہت زیادہ سادی ہوجاتا ہے اور کوئی خاص لطف نہیں دیتا۔ البتہ دوسرے مفہوم میں (جیسا کہ معترض نے ظاہر کیا ہے) شعر بلند ہوجاتا ہے۔ مومن یہ کہنا چاہتا ہے کہ "تمھاری نگہ گرم کے لئے میری تشنہ کامیاں اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ جب میں پانی یعنی مادی ذریعہ رفعِ تشنگی کو دیکھتا ہوں تو بھی خیال فوراً اپنی روحانی تشنگی کی طرف منتقل ہوجاتا ہے اور رو پڑتا ہوں" یقیناً شارح نے اس شعر کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔

[2] (نگار) شارح کا مفہوم صحیح ہے۔

[3] (نگار) "ممکن" نہیں "ضروری" کہئے۔

شارح :- "ناتواں ہیں -- حاسد جو کسی کا برا چاہے - یہاں معشوق مراد ہے"

ناتواں ہیں - حاسد نہیں بلکہ عیب جیتیں - کسی کی کمزوری یا نقص کو دیکھنے والا۔[۱]

مومن :- زخمی کیا عدو کو تو مرنا محال ہے
قربان جاؤں تیرے مجھے نیمجاں نہ چھوڑ،

شارح :- "تم نے جو رقیب کو زخمی کیا ہے - تو اس رشک سے میں بھی بسمل ہو گیا ہوں - مگر محض اتنی بات سے میرا مرنا محال ہے - اگر تم (صدمہ رشک سے) مجھے بالکل ہلاک کرنا چاہتے ہو - تو میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ مجھے نیمجاں نہ چھوڑو اور اسکی صرف ایک صورت ہے یعنی رقیب کو بالکل قتل کر دو - میں خود غیرت سے مرجاؤنگا - یہ مکر شاعرانہ مومن سے مخصوص ہے"

جدید سائنٹفک تحقیقات سے ایک نئی ادا "مکر شاعرانہ" مومن کی خصوصیات میں دریافت ہوئی ہے - یہ شعر اسکی بہترین مثال ہے - خلاصہ شرح یہ ہے کہ مومن مکاری سے غیر کے قتل کی التجا کرتا ہے -- مومن غیر کے زخمی کرنے کا بھی ملتجی نہیں - چہ جائے قتل - معنی یہ ہیں کہ اگر تو نے عدو کو اپنی ادا کا مایل (زخمی) کیا - اپنا عاشق بنایا - اپنے نظارہ کا بھی موقع دیا - تو میرا تجھ پر (مرنا) فدا ہو جانا تجھ سے محبت کرنا محال ہے - مگر ہاں تیری اس ادا سے یا ترک محبت سے میرا نیمجان (مضطرب) رہنا لازم ہے - میں تیرے قربان جاؤں مجھے نیمجاں نہ رکھ - بلکہ موقع دے کہ میں تیری ہی محبت میں فنا ہو جاؤں تجھ پر فنا ہو جاؤں۔[۲]

مومن :- یہ غیرت وفا کا اثر ہے کہ بوالہوس
بسمل تڑپتے ہیں ترے بسمل کے آس پاس

شارح :- "میری وفا دیکھکر رقیبوں کو بھی غیرت آئی - نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر میں بسمل پڑا ہوں اُدھر وہ بسمل ہو کر میرے پاس تڑپتے پھرتے ہیں"

شرح کا حاصل یہ ہوا - کہ اغیار کو یہ غیرت آئی کہ ہم بھی ایسے ہی وفا شعار عاشق ہو جائیں - اور وہ عشق صادق سے میری طرح بسمل ہو گئے - غیرت وفا سے مراد، غیرت عشق ہے کہ جان دی ترک محبت نہ کیا - بوالہوس کو امتیاز ہوا کہ عشق و ہوس میں فرق ہے اور تڑپ گیا۔[۳]

مومن :- کیا کیا جلی ہے بزم میں تجھ سے نہ جب پھرے
پروانے شمع شعلہ شمایل کے آس پاس

شارح :- "شعلہ شمایل - شعلہ کی صورت رکھنے والی - یعنی جب تیری موجودگی میں پروانے شمع کے پاس نہ پھٹکے تو وہ تجھ سے کسقدر جلی ہے"

یعنی پروانے بجائے شمع کے تیری طرف مایل ہوئے اور شمع آتش رشک میں جلگئی - شمع کے گرد پروانے ہر وقت نہیں ہوتے شمع نے دیکھا کہ تمھارے عشاق تم سے باوجود شعلہ خوئی عاشق کشی، ایک لحظہ جدائی پسند نہیں کرتے - یوں شمع آتش رشک سے جلگئی۔[۴]

تنویر قادری

---

۱ (نگار) "ناتواں ہیں" کے معنے شارح نے صحیح نہیں سمجھے -- ۲ معترض اس شعر کا مفہوم بالکل نہیں سمجھے اور مکر شاعرانہ کو انھوں نے کوئی بڑا اخلاقی گناہ سمجھکر مومن کو اس سے بری ثابت کرنے کی کوشش میں شعر کا مفہوم ہی بالکل بدل دیا - یہ بالکل صحیح ہے کہ مومن اس انداز بیان کا مالک ہے اور اس قسم کے اشعار اسکے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں -- ۳ (نگار) شارح نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ بوالہوس بھی بسمل کی طرح بسمل ہو گئے، مدعا صرف یہ ہے کہ وہ عاشق کے امر امتیاز کو دیکھ کر کہ معشوق نے انھیں بسمل کیا، تڑپ کر رہ گئے - ۴ (نگار) پروانوں کو بسان "عشاق" سمجھنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا - شارح نے بالکل صحیح سمجھا ہے۔

لامذہبیات

دُنیائے عیسویت کا ایک پرعظمت وجلال باغی

والٹیر

ایک زمانہ کے ملحدین اکثر وبیشتر دوسرے زمانہ کے مستند مقدسین میں شمار کئے گئے ہیں۔

پرانی چیزوں کے بگاڑنے والے نئی چیزوں کے خلاق ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے پرانی باتیں ختم ہوتی جاتی ہیں اور نئی چیزیں ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔

جسمانی دُنیا کی طرح عقلی دنیا میں بھی عروج وزوال ہوتا رہتا ہے اور مسرت وشباب مدفون شدہ زمانہ کی قبروں کے پاس نظر آتے ہیں۔

عقلی ترقی کی تاریخ ملحدین کی سوانحمریوں میں مل سکتی ہے۔ سیاسی آزادی غداروں کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے اور آزادیِ فکر وخیال ملحدین کے ذریعہ سے۔

سلطان وقت کی مخالفت کرنا بغاوت تھی اور پادری کی مخالفت کُفر۔

تلوار اور صلیب صدیوں تک حلیف رہے اور دونوں نے متحد ہوکر انسانی حقوق پر حملے کئے۔

جیمس اول کہا کرتا تھا "پادری نہیں تو بادشاہ نہیں" وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ: "صلیب نہیں تو تاج نہیں"
بادشاہ کے قبضہ میں آدمیوں کے جسم تھے اور پادری کے ہاتھ میں ان کی روحیں۔ ایک اُن محاصل پر بسر کرتا تھا جو زبردستی وصول کئے جاتے تھے اور دوسرا اس خیرات پر جو ڈرا ڈرا کر جمع کی جاتی تھی۔۔۔ دونوں ڈاکو، دونوں گداگر!

یہ ڈاکو دو دنیاؤں کو قابو میں رکھتے تھے بادشاہ قانون بناتا تھا اور پادری عقاید۔ دونوں اپنے اختیارات خدا سے حاصل کرتے تھے اور دونوں "لا انتہا" کے نمایندے تھے۔

ایک کا بار وہ اپنی جھکی ہوئی کمر پر اُٹھائے ہوئے تھے اور دوسرے کے اصول حیرت زدہ کھُلے ہوئے منھ کے

ساتھ ماننے پر مجبور تھے۔

اگر عوام آزادی کا خیال دل میں لاتے تو بادشاہ ان کو کچل دیتا اور ہر پادری گویا ایک دیوتا تھا جو عقل رکھنے والے لیچوں کا خاتمہ کر دیتا تھا۔

بادشاہ جبر کے ذریعہ سے حکومت کرتا اور پادری خوف کے ذریعہ سے اور دونوں، دونوں ذریعوں سے۔

بادشاہ نے عوام سے کہا "خدا نے تم کو کسان بنایا اور مجھے بادشاہ۔ اُس نے تم کو مزدوری کرنے کے لئے اور مجھے عیش کرنے کے لئے پیدا کیا۔ اُس نے تمھارے لئے گدڑی اور جھونپڑا بنایا اور میرے لئے نفیس کپڑے اور محل۔ اُس نے تم کو اطاعت شعاری کے لئے پیدا کیا اور مجھ کو حکمرانی کے لئے۔ خدا کا انصاف یہی ہے"

پادری نے کہا: "خدا نے تم کو جاہل اور کمینہ بنایا اور مجھے مقدس و فرزانہ تم بھیڑ ہو میں چرواہا۔ تمھارا اُون میرا ہے۔ اگر تم میری اطاعت نہ کرو گے تو خدا تم کو یہاں بھی سزا دے گا اور دوسری دنیا میں بھی۔ خدا کا رحم اسی کو کہتے ہیں"

"دلیل پیش نہ کرو۔ دلیل باغیانہ جرم ہے۔ تردید نہ کرو، تردید خود رائی کا نتیجہ ہے۔ جس کے پاس کان ہیں اُسے صرف سننا چاہئے اور ماننا چاہئے۔

لیکن خوش قسمتی سے دنیا میں غدار بھی پیدا ہوئے اور منکرین بھی، اور یہی وہ ہیں جنھوں نے اپنی جانیں دے دیکر صحیح معنے میں نوع انسانی کی خدمت انجام دی۔ "عظمت کیا چیز ہے؟"

واجب عظمت، وہ انسان ہے جو بضاعت علم میں اضافہ کرتا ہے، روح کو خوف کے پنجہ سے نجات دلاتا ہے مجہول اور گمنام سمندروں کو عبور کرتا ہے قلم و فکر کو نئے براعظم اور نئے جزائر عطا کرتا ہے اور فضائے دماغ میں ایک نئی کہکشاں پیدا کرتا ہے۔ بڑا آدمی تعریف یا اعلیٰ مقام نہیں تلاش کرتا۔ وہ صداقت کی جستجو کرتا ہے وہ مسرت کی راہ ڈھونڈھتا ہے اور جو چیز وہ پالیتا ہے وہ دوسرے کو بھی دیتا ہے۔

بڑا آدمی تاریکی میں ایک مشعل ہے، اوہام کی رات میں منارۂ روشنی ہے۔ ایک الہام۔ ایک پیشین گوئی!

عظمت، تحفۂ عوام نہیں ہے۔ وہ کسی کو بہ جبر نہیں دی جا سکتی۔

بڑے آدمی حقیقتاً وہ لوگ ہیں جنھوں نے انسان کے جسموں کو آزاد کرایا ہے۔ وہ فلسفی اور مفکرین ہیں جنھوں نے روح کو آزادی دلائی ہے۔ وہ ایسے شاعر ہیں جنھوں نے کروڑوں کی زندگی میں محبت کا نغمہ بھر دیا ہے۔ وہ ایسے مصور ہیں جنھوں نے حیاتِ پریشاں کی بے رنگیوں کو عقل و فراست کے نقوش سے مزین کیا ہے۔ وہ، وہ سورما ہیں جنھوں نے جہالت و خوف کے دیوتاؤں کو قتل کیا ہے، یہ لوگ وہ موجد، وہ محقق، وہ کاریگر اور سلطان العلوم ہیں جنھوں نے اس دنیا کو مہذب بنایا ہے۔

پھر اس زبردست فوج میں سب کے آگے، ہم کو کون نظر آتا ہے وہ کون ہے جو سالارانہ عزم و ارادہ کے ساتھ لوائے حریت و آزادی بلند کئے ہوئے ہے۔

والٹیر! والٹیر! والٹیر!

وہ انسان، جس نے دنیائے کلیسا میں ہلچل ڈال دی اور مذہبی خانقاہوں کی بنیادیں ہلا کر رکھدیں۔ کسی پادری کے سامنے یہ نام لے لو تو تمھیں ایسا معلوم ہوگا کہ گویا تم نے اعلان جنگ کر دیا ہے۔ اس مقدس پرستار کلیسا کے ہاتھ سے دامن ضبط و تحمل چھوٹ جائے گا اور اس کے منھ سے لعنت و ملامت کی آبشار جاری ہو جائے گی۔

سنیچر، ۲۱ رنومبر ۱۶۹۴ء کو ایک بچہ پیدا ہوتا ہے ۔۔ اسقدر نحیف و ناتواں کہ سانس کو اُس کے جسم کے اندر رہنے میں تامل ہے، اُس کے والدین جلد از جلد اُس کو اصطباغ دلانا چاہتے ہیں۔ وہ بچہ کی روح کو نجات دلانے کے لئے پریشان ہیں کیونکہ انھیں یقین تھا اگر بپتسمہ لینے سے قبل موت آگئی تو بچہ کی قسمت میں ابدی مصیبت و تکلیف لکھی ہے۔ اور خدا اُس بچہ سے نفرت کرتا ہے جس پر پادری کے ہاتھ نے پانی نہیں چھڑکا ہے۔ جس پادری نے پانی کے چند قطرے چھڑک کر اس بچہ کا نام فرانکوئس میری اروٹ FRANCOIS MARIE AROUET رکھا اور اس کی روح کو ہلاکت سے بچالیا لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ اتنی تہوں میں لپٹا ہوا بچہ جو سانس بھی مشکل سے لے سکتا ہے۔ ایک دن، آزادی کے گلوئے مرمریں کے اندر گڑوئے ہوئے زندہ کلیسا کے پنجے علیحدہ کرے گا۔

جب والٹیر، "اس اسٹیج" پر آیا تو اس کے ملک کو "عیسائی" ہوئے تقریباً ۱۴۰۰ برس گزر چکے تھے۔

اس حال میں کہ بادشاہ قانون بناتا تھا اور مقدس اہل کلیسا ان کی منظوری دیدیتے تھے۔

اس نام نہاد اخوت عامہ کے عہد سعید میں ہر عدالت "شریعت تعذیب" کی حامی تھی اور ہر پادری اپنے شکنجوں اور آلہ ہائے تعذیب سے آسانی بادشاہت قایم کرنے پر تلا ہوا تھا۔

برگزیدہ انجیل نے علوم وفنون کو نجس و ناپاک قرار دیدیا تھا اور آزادی کے ساتھ کسی خیال کا اظہار ایسا سنگین جُرم تھا کہ مذہب کی تلوار کبھی اسے معاف نہ کرتی تھی۔

محبت کے خدا، اور ابدی باپ کے پرستار ظلم و جبر کے سوا کچھ نہ جانتے تھے اور وہ لوگوں کو مجبور کرتے تھے کہ اپنے جرم کا اقرار کرلیں۔ اور اپنے ساتھیوں کا نام بتادیں۔ الغرض "مذہب" کے پاس سوائے ظلم کے کوئی اصلاحی قوت باقی نہ رہ گئی تھی۔

یہ ۱۶۹۴ء کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب تمام مصنفین، بادشاہ اور پادریوں کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرتے تھے اور ان میں سے اکثر جیلخانوں میں ڈالدئے گئے، جلاوطن کردئے گئے اور قتل کرڈالے گئے!

—— جو تھوڑا بہت وقت جلادوں کو اپنے پیشہ کے فرائض سے بچتا وہ کتابیں جلانے میں صرف ہوتا تھا۔

انصاف کی عدالتیں ایک جال تھیں جن میں معصوموں کو پھانسا جاتا اور وہاں بیٹھکر انصاف کرنے والے بھی گویا درۂ خداوندی تھے جنھیں انسانی جلد کو لہولہان کرنے کے علاوہ اور کچھ بھی نہ آتا تھا۔

گواہ جن کو خود مبتلائے عذاب کا خطرہ رہتا تھا مجبوراً وہی کہتے تھے جو جج سننا چاہتا تھا۔

مافوق الفطرت اور حیرت انگیز ہستیاں دنیا پر حکمرانی کرتی تھیں۔ بات ہر ایک سمجھائی جاتی تھی مگر سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ جب کوئی بیمار پڑتا تھا تو وہ ڈاکٹر کو نہ بلا سکتا تھا بلکہ پادریوں کو طلب کرتا تھا اور یہ پادری بیماروں اور مرنے والوں کو تعویذ دیکر ان سے بڑی بڑی رقمیں وصول کیا کرتے تھے۔ دنیا کو بہ جبر تسلیم کرایا جاتا کہ یہ کاغذ کے ٹکڑے ہر قسم کی بیماری کو دفع کرسکتے ہیں اور اگر ان کو بچہ کے گہوارہ میں رکھ دیا جائے تو اس پر کسی قسم کا آسیب مسلط نہیں ہوسکتا۔ الغرض، پادری یہی سکھاتے کہ تمام بیماریاں اور تمام مصائب خدا کا نام لینے سے دور ہوسکتے ہیں یعنی تمام امراض کا علاج، دعائیں، ریاضت، ولیوں کی ہڈیاں یا صلیب کی لکڑی چھونا، مقدس پانی چھڑک لینا یا جادو کا تیل جسم پر لگا لینا ہے۔

اُس زمانہ میں مرے ہوئے راہبوں کی روحیں بہترین معالج سمجھی جاتی تھیں اور ان کا نام لیکر کوئی گٹھیا اچھا کرتا، کوئی کھانسی، کوئی نزلہ دور کردیتا کوئی بخار، کوئی مرگی کو شفا بخشتا، کوئی سرطان کو۔ کوئی مارگزیدہ کو اچھا کردیتا، اور کوئی مبروص و مجذوم کو۔

"چرچ" کو یقین تھا کہ فضا میں صرف ارواح خبیثہ ہی بھری ہوئی ہیں، اور ہر گنہگار کے اندر شیاطین حلول کئے ہوئے ہیں۔

شیطان کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اُسے ہوا پر پوری قدرت حاصل ہے۔ بجلی، سیلاب، اور کہر وغیرہ پر اُسی کی حکومت قایم ہے۔ چنانچہ اس شیطانی حکومت کے انسداد کے لئے گرجے کی گھنٹیوں اور مقدس پانی سے کام لیا جاتا تھا۔ یعنی ان گھنٹیوں پر مقدس پانی چھڑکا جاتا تھا اور جب وہ بجتی تھیں تو یہ تصور کیا جاتا تھا کہ فضائے آسمانی ارواح خبیثہ سے پاک ہوگئی ہے۔

اُس زمانہ میں نہ صحیح آزادی تھی، نہ صحیح تعلیم، نہ صحیح فلسفہ، اور نہ صحیح سائنس،—— جو کچھ تھا وہ اوہام پرستی تھی اور دنیا "چرچ" اور "شیطان" دو چیزوں کے قبضہ میں تھی!

"چرچ" کو شیاطین، ارواح خبیثہ اور جادوگروں کی ہستی پر کامل یقین تھا اور اس طرح "چرچ"

اپنے ہر دشمن پر قابو پالیتا تھا، اس کے لئے اتنا کافی تھا کہ وہ کسی پر "جادوگر" ہونے کا الزام لگادے، پھر یہ کام عوام کا تھا کہ وہ اُس "ساحر" کے جسم کا ایک ایک ریشہ نوچکر پھینکدیں۔ سحر و ساحری کے اعتقاد کا یہ عالم تھا کہ شوہر اپنی بیوی پر شک کرتا اور بیوی شوہر پر، لڑکے والدین کی طرف سے مشکوک تھے اور والدین لڑکوں کی طرف سے یہاں تک کہ اس وہم نے انسانی اخوت ومحبت کے رشتوں کو توڑ دیا تھا، عدالتوں سے انصاف کو نکال دیا تھا، دوستی کے تعلقات کو منقطع کردیا تھا اور حیات انسانی کے جام زریں میں سوائے زہر ہلاہل کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یہ تھا نتیجہ ایک "مافوق الفطرت ہستی" پر اعتقاد رکھنے کا، عقل انسانی کو معطل کردینے کا، اور اپنے بجائے پادریوں پر بھروسہ کرنے کا!

جب والٹیر پیدا ہوا تو فرانس پر مذہب کی حکمرانی تھی۔ پادری حد درجہ عیاش تھے اور جج عموماً ظالم۔ قصر شاہی کسبیوں کا گھر تھا اور عوام کے ساتھ جانوروں کی طرح سلوک کیا جاتا تھا۔ مگر یہ ظلم کرنے والے اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ وہ کس طرح انقلاب کا بیج لوگوں کے دلوں میں بو رہے ہیں۔ اور وہ مزدور جن کی کمر خم ہوگئی تھی، جن کے چہرے دھوپ سے سیاہ ہوگئے تھے اور جن کے خون سے دوسروں کی کھیتی تیار ہوا کرتی تھی جب قصر وخانقاہ کی عورتوں کے سفید گلے دیکھتے تو اُن کو کاٹ ڈالنے کے لئے کس کس طرح بیتاب ہوجاتے تھے۔

ایک "بڑے آدمی" یا "عظیم شخصیت" کا حال معلوم کرنے کے لئے ہم کو اُس کے ماحول سے بھی واقف ہونا چاہئے، اس لئے آیئے دیکھیں کہ والٹیر کے زمانہ میں دُنیا کی کیا حالت تھی۔

انگلستان میں جارج دوم بادشاہ تھا اور قانون کی رو سے ۲۲۳ جرائم ایسے تھے جن کی سزا موت تھی، قید خانے قیدیوں سے بھرے تھے اور قصاص گاہ میں ہر وقت آدمیوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی!

اسپین میں دماغی ترقی کے تمام راستے مسدود تھے۔ اسپین ۔۔۔ وہ اسپین جس نے یہود کو نکال دیا تھا یعنی اپنی عقل کو، وہ اسپین جس نے مسلمانوں کو نکال دیا تھا یعنی اپنی صنعت وحرفت اور اعلیٰ معیار زندگی کو ۔۔ اب بھی ہر ممکن ذریعہ سے ملک کو مذہبی بنانے کی کوشش کر رہا تھا!

پرتگال میں عورتوں اور بچوں کو اس جرم میں جلایا جارہا تھا کہ کیوں انھوں نے اُس دن گوشت کھالیا جس دن انھیں فاقہ کرنا چاہئے تھا۔۔ اور یہ سب کچھ ایک نہایت رحمدل خدا کو خوش کرنے کے لئے ہوتا تھا!

اٹلی میں بھی پادریوں اور راہبوں کی حکومت تھی اور منکرین وملحدین کے لئے "عدالتیں" وہاں بھی کثرت سے پائی جاتی تھیں۔ اور یہی حال جرمنی کا تھا۔

والٹیر کے ایام شباب

والٹیر کا اصلی نام فرینکوس میری ارویٹ FRANCOIS MARIE AROUET تھا اور ماں کا نام مارگرٹ ڈی امرڈ MARGUERITE D. AUMARD سات برس کی عمر میں ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ والٹیر کا ایک بڑا بھائی ارمانڈ ARMOND بھی تھا۔ یہ بیچارہ گرجوں میں اس لئے نذر و نیاز چڑھایا کرتا تھا کہ بھائی گناہ کرتا ہے تو اُسے کچھ ثواب مل جائے۔ جہاں تک معلوم ہے والٹیر کے آبا و اجداد میں کوئی بھی علم و ادب کا شایق نہ تھا۔ دس برس کی عمر میں والٹیر کو ایک اسکول میں داخل کیا گیا جہاں وہ سات برس تک پڑھتا رہا مگر بقول خود اس اسکول میں بجز تھوڑی سی یونانی، لاطینی اور بہت سی حماقت آب باتوں کے اس نے کچھ نہ پڑھا اور پھر اس کے بعد کسی اسکول میں داخل بھی نہ ہوا۔ اس اسکول میں نہ جغرافیہ پڑھایا جاتا تھا نہ تاریخ، نہ ریاضی اور نہ سائنس۔ یہ اسکول جیسوئٹ پادریوں کا اسکول تھا!

۱۷ برس کی عمر میں والٹیر نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی زندگی علم و ادب کے لئے وقف کر دے گا چنانچہ اس کا باپ اپنے دونوں لڑکوں کے بارہ میں کہا کرتا تھا کہ میرے لڑکے صحافت کے پُتلے ہیں، ایک نثر میں دوسرا نظم میں۔

۱۷۱۳ء میں والٹیر کسی چھوٹی سی سیاسی خدمت پر مامور ہوگیا اور فرانسیسی وزیر کے ساتھ "ہیگ" گیا۔ یہاں اُسے ایک لڑکی سے عشق ہوگیا۔ لڑکی کی ماں کو یہ محبت پسند نہ آئی۔ والٹیر کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے کپڑے اپنی معشوقہ کے پاس بھیجے کہ انھیں پہن کر پوشیدہ طور پر چلی آؤ مگر اتفاق سے اس سازش کا پتہ چل گیا اور والٹیر برخاست کر دیا گیا۔

والٹیر کا باپ یہ واقعہ سن کر اتنا ناراض ہوا کہ اُس نے اپنے لڑکے کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کرا دیا اور اُس سے کہا کہ یا تو تم سمندر پار چلے جاؤ یا جیلخانہ۔ آخر کار والٹیر، وکالت کرنے پر آمادہ ہوا چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

"میں ایک ہفتہ سے ایک وکیل کے دفتر میں کام کر رہا ہوں اور "ٹٹ پونجیا" وکیل کا پیشہ سیکھ رہا ہوں"۔ کچھ عرصہ کے بعد والٹیر کو اس پیشہ سے بالکل نفرت ہوگئی اور اُس نے نظمیں لکھنا شروع کیں۔

یہ وہ وقت تھا جب عوام کے سامنے بعض نئے مسایل آگئے تھے۔

۱۶۵۲ء میں ڈاکٹر بیاس نے مسایل قضا و قدر اور جبر و اختیار پر اپنے کچھ نظریے پیش کئے تھے۔ راہبوں نے ان نظریوں کو پوپ کے پاس بھیجا وہاں سے جو فرمان موصول ہوا اس کی عبارت صاف نہ تھی

چنانچہ پوپ سے اس عبارت کا مطلب پھر پوچھا گیا مگر وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا اور یہ جھگڑا عرصہ تک جاری رہا۔ اس کے بعد جانسنئسی اور مولینوی طبقوں کا جھگڑا چلا۔ جانسینئس ایک فرانسیسی تھا جو قضا و قدر کا قایل تھا اور کہتا تھا کہ خدا ان چیزوں کا بھی حکم دیتا ہے جو ناممکن ہیں اور یہ کہ حضرت عیسیٰ کا انتقال نہیں ہوا مولینی ایک اسپینی تھا اور کہتا تھا کہ انسان اپنی مرضی میں آزاد ہے مگر خدا جانتا ہے کہ وہ اس کو کس طرح سے استعمال کرے گا۔ ۱۶۴۱ء میں "جانسینیوں" کی مخالف پارٹی نے ایک فرمان حاصل کیا جس میں جانسینئس کے پانچ نظریوں کی مذمت کی گئی تھی جانسینیوں نے اس پر یہ کہا کہ یہ نظریے جانسینئس کی کتابوں میں موجود ہی نہیں ہیں۔ اس کے بعد ۱۷۱۳ء میں ایک فرمان اور حاصل کیا گیا جس کی رو سے جانسینئس کے تمام پیرو جیلخانوں میں بھر دئے گئے۔ قصہ مختصر یہ کہ قضا و قدر اور جبر و اختیار کا جھگڑا اسوقت تمام یورپ میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے بعد جب لوئی چہار دہم کا انتقال ہوگیا اور سلطنت فرانس ایک کونسل کے ہاتھ میں آئی تو تمام پرانے قیدی چھوڑ دئے گئے مگر کچھ عرصہ کے بعد ان کی جگہ نئے قیدیوں سے بھر گئی۔

اس وقت تک والٹیر کو مذہب یا حکومت سے اتنی دلچسپی نہیں پیدا ہوئی تھی اور وہ یا تو نظمیں لکھا کرتا تھا یا کامیڈی اور ٹریجڈی۔ لیکن اس پر بعض طنزیہ تحریریں لکھنے کا الزام لگایا گیا اور بطور سزا اُسے جلا وطن کر کے ٹلے بھیجدیا گیا جو ۳۰۰ میل دور تھا۔ والٹیر نے یہاں سے لکھا کہ میں ایسے مقام پر ہوں جہاں اگر مجھے جلا وطن نہ کیا جاتا تو وہ میرے لئے سب سے زیادہ دلخوش کن مقام ہوتا یہاں میری مسرت کامل میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے سوائے اس کے کہ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت نہیں ہے۔

آخرکار اُسے رہائی مل گئی مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُسے پھر گرفتار کر لیا گیا اور اب کی مرتبہ اُسے ایک سال کے لئے بیسٹائل بھیج دیا گیا۔ یہاں کے قید خانہ میں اُس نے اپنا نام "والٹیر" رکھا اور اسی نام سے وہ آجتک مشہور ہے۔ اس کے بعد وہ انگلستان بھیجدیا گیا۔ اور یہاں وہ برطانیہ کے مشہور ادیبوں سے ملا۔

اب والٹیر مذہب کے بارہ میں تحقیقات کرنے لگا تھا اور رفتہ رفتہ اس نتیجہ پر پہونچ رہا تھا کہ مذہب منحصر ہے کتب مقدسہ کے الہامات پر، پاگل فقیروں کے خوابوں پر، "بزرگوں" کے جھوٹ پر، پادریوں کی چالاکیوں پر مقدس راہبات کے ہسٹریا کے دوروں پر، اور عوام کی بیوقوفیوں پر! اس کو اسی تحقیق کے دوران میں اسکا بھی پتہ چلا کہ ۳۲۵ء سے جب شاہ قسطنطین نے مذہب عیسوی قبول کیا تھا چودھویں صدی کے آخر تک عیسویت کے متعلق نہ معلوم کتنی کانفرنسیں ہوئیں مگر چند معمولی باتوں کے سوا اور کچھ نہ معلوم ہوسکا۔ والٹیر کو اب اس کا بھی احساس ہوا کہ ان احمقانہ عقائد کی وجہ سے دنیا میں ظلم و خوف کا دور دورہ ہوگیا ہے، تصویریں، چوبی صلیب، پرانی ہڈیاں اور لکڑی کے ٹکڑے آدمیوں کے حقوق اور ان کی زندگیوں سے زیادہ قیمتی سمجھے

جاتے ہیں۔ اور ان آثار کے محافظین نسل انسانی کے دشمن ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنی پوری قوت سے ان طاغوتی طاقتوں پر حملہ کرنا شروع کیا۔

والٹیر عقل سلیم کا دیوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا میں ایسی کوئی زبان نہیں ہو سکتی جس سے تمام زبانیں نکلی ہوں۔ اُسے یہ معلوم تھا کہ ہر زبان پر اُس کے ماحول کا اثر ہوا ہے۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ برف اور یخ کی زبان پھول پتیوں کی زبان نہیں ہو سکتی۔ وہ اس سے واقف تھا کہ منارۂ بابل کی کہانی غلط ہے اور اس کو اس چیز کا علم تھا کہ دنیا میں ہر چیز فطری ہے۔

والٹیر نہایت خوش مزاج، ظریف اور ہنس مکھ شخص تھا۔ اُسے غیر فطری عقاید اور مذہب کے خشک فلسفے سے سخت نفرت تھی اور اسی لئے عیسویت نے ہمیشہ اُس کی مذمت کی، اور وہ ہر فرقہ کے پادریوں کا نشانۂ ملامت بنا رہا۔

لیکن والٹیر نے یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ اپنے زمانہ کے توہمات کا خاتمہ کر کے چھوڑیگا۔ اور اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ہر حربہ کو استعمال کیا۔ وہ مضحکہ اڑانے میں حاضر جوابی ظرافت میں یگانۂ عصر تھا اور اس نے ان تمام ذرایع سے خرافیات مذہب کا مقابلہ شروع کر دیا۔

والٹیر چاہتا تھا کہ پیروان مسیح کو مہذب بنایا جائے اور قتل و خون سے انھیں باز رکھا جائے۔ چونکہ یہ اصلاح پادریوں کے مفاد کے خلاف تھی اس لئے اس کی سخت مخالفت کی گئی۔ اگر وہ خود کوئی اپنا مذہبی فرقہ قایم کر لیتا اور چند "ملحدین" کو آگ میں جلا دیتا تو تمام عیسوی دنیا سے خراج تحسین وصول کرتا۔ اگر وہ پرانے افسانوں کو سچا باور کر لیتا، اگر وہ لاطینی دعاؤں کو یاد کر لیتا یا اگر وہ اپنے زمانہ کے عقائد کو تسلیم کر کے مان لیتا کہ ایک "لا انتہا" اور رحمان و رحیم "خدا نے کروڑوں انسانوں کو محض ابدی عذاب میں مبتلا رکھنے کے لئے پیدا کیا ہے، اور یہ کہ اُس نے اپنی ساری طاقت و جبروت ایک چالاک اطالوی پوپ کو دیدی ہے، اگر وہ آسمانی "خدا" کی ناک میں جلتے ہوئے گوشت کی خوشبو پہونچانے کا سامان کرتا اور اس کے کانوں میں مظلوموں کی چیخوں کو بھر دیتا تو آج وہ مقدس والٹیر کہلاتا۔

والٹیر اپنے مضامین، طنزیہ اشعار، کامیڈی، ٹریجڈی، تاریخ، نظموں اور فسانوں کے ذریعہ سے پادریوں پر ۶۰ برس تک حملہ کرتا رہا اور کبھی کسی کا محتاج نہ رہا۔ وہ کماتا بھی رہا اور اپنے مشن میں بھی مصروف رہا حتی کہ ایک زمانہ وہ آیا جب وہ شاہزادوں کی طرح رہتا تھا اور یورپ کی ایک زبردست طاقت شمار کیا جاتا تھا۔

عیسائی کہتے ہیں کہ والٹیر سخت بے ادب تھا کیونکہ وہ مقدس چیزوں کا بغیر کسی سنجیدگی کے محاسبہ کرتا تھا مذہبی مراسم کے موقعوں پر اپنے جوتے نہیں اتارتا تھا۔ وہ موسیٰ کے علم طبقات الارض پر مسکراتا تھا۔ اجسام

فلکی کے بارہ میں انجیل کی تعلیم پر وہ ہنستا تھا۔ لیکن والٹیر کہتا تھا کہ جھوٹ خواہ کتنا ہی پرانا ہو جائے، سچ نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی بات اُس وقت تک قابلِ پرستش نہیں ہو سکتی جب تک دلایل سے یہ نہ ثابت ہو جائے کہ واقعی وہ پرستش کے قابل ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ تمام معجزے اور تمام مقدس اوہام اس کے تیر ملامت کا نشانہ بنے۔

وہ کہتا تھا کہ حماقتوں کا جواب صرف یہی ہے کہ ان کا مضحکہ اڑایا جائے۔ اُس آدمی سے عقلی بحث کیونکر کی جا سکتی ہے جو یہ یقین رکھتا ہے کہ صلیبی نشان رکھنے والی روٹی کے کھانے سے اُس نے خداوندانِ ثلاثہ کو کھا لیا ہے اُس پادری کو کیسے قایل کیا جا سکتا ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ ایک گھونٹ شراب کا پی کر اُس نے خدائے غیر تناہی کو پیٹ میں اُتار لیا ہے اور اُس انسان کو کیسے معقول کیا جا سکتا ہے جو اس امر کو مانتا ہے کہ مقدس روٹی کا جو حصہ بچے اُسے کونے میں چھپا کر رکھ دیا جائے تاکہ چوہیاں خدا کو نہ کھانے پائیں۔ بھلا بتلائیے کہ منطق اُس متشرع آدمی پر اپنا کیا اثر ڈال سکتی ہے جس کا یہ عقیدہ ہو کہ ایک مرتبہ تیس چالیس چھوٹے بچے ایک پیغمبر کو دیکھ کر ہنس پڑے تو خدائے رحمٰن و رحیم نے دو ریچھوں کو بھیجا جنھوں نے بچوں کو چیر پھاڑ کر کھا ڈالا۔ جن لوگوں کی عقلوں کا یہ عالم ہو ان کو ان کی حماقتوں کا احساس کیسے کرایا جا سکتا ہے۔ اس کا علاج صرف یہی ہے کہ انھیں ہدفِ ملامت بنایا جائے اور ان پر ایسے تیر برسائے جائیں جو ان کے سینوں کو چھلنی کر دیں اور یہی وجہ ہے کہ والٹیر کو استہزا کرنے والا بتایا جاتا ہے۔ اسنے بیشک مذاق اڑایا لیکن کس کا؟ ان بادشاہوں کا جو ظالم تھے، ان خطاب یافتہ امرا کا جو مغرور و متکبر تھے ان عدالت گاہوں کا جو جور و ظلم کا مرکز تھیں، ان پادریوں کا جو عقلِ انسانی کو دنیا سے محو کر رہے تھے، اُن مورخوں کا جو تاریخ کے صفحات کو جھوٹ سے بھر رہے تھے اور ان فلسفیوں کا جو اوہام پرستی کی تائید کرتے تھے۔

والٹیر برسوں تک، باوجود عالمگیر دورِ تظلم کے خدا کو اور بقول خود "مذہبِ فطرت" کو مانتا رہا اور اس دوران میں وہ اپنے عہد کے عقاید پر اس وجہ سے حملہ کرتا رہا کہ وہ اس کے نزدیک قابلِ ملامت تھے وہ اپنے خدا کو ایک سرچشمۂ رحمتِ بے پایاں و انصافِ بیکراں تصور کرتا تھا مگر مذہبی پیشوا جس خدا کو پیش کرتے تھے وہ حماقت اور ظلم کا مجسمہ ہوتا تھا۔ چنانچہ والٹیر نے اپنی پوری طاقت سے انجیل پر حملہ کیا۔ اُس نے انجیل کے بتائے ہوئے علم طبقات الارض، اس کے نظریاتِ عدل و انصاف، اس کے قوانین، اس کے مراسم، اس کے معجزوں، اس کی کرامتوں، اس کی ظالمانہ دھمکیوں، اور اس کے مبالغہ آمیز مواعید کی دھجیاں اڑا دیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اُس نے اُس خدا کی تعریف بھی کی جو ہم کو پانی دیتا ہے، غذا دیتا ہے، پھل دیتا ہے، پھول دیتا ہے، تندرستی دیتا ہے اور جس نے دنیا کو رعنائی اور حسن سے معمور کر دیا ہے

اُس پر خود بھی ہر طرف سے حملہ کیا جا رہا تھا مگر وہ اپنے حربوں سے جن میں عقل، منطق، دلایل، براہین، طنز، تمسخر اور استہزا سبھی کچھ شامل تھے۔ اپنے مخالفین سے جنگ کرتا تھا۔ اُس نے اکثر معافی بھی مانگی مگر وہ معافی بھی ایک قسم کی توہین ہوا کرتی تھی۔ اُس نے کئی مرتبہ اپنی تردید بھی کی مگر وہ تردید گناہ سے بھی بد تر ہوا کرتی تھی۔ اس کی تعریف میں بھی زہر ہلاہل ہوا کرتا تھا اور اس کی پسپائی میں بھی سبقت ہوتی تھی۔

وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ پادری اُس کو زندہ جلوا کر اطمینان سے بیٹھ سکیں۔ چنانچہ اپنی تردید کے متعلق اُس نے لکھا تھا کہ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں اپنے خیالات و الفاظ واپس لے لوں۔ بہت اچھا میں اس کے لئے بڑی خوشی سے تیار ہوں۔ میں یہ کہے دیتا ہوں کہ پوپ ہمیشہ حق پر ہوتا ہے۔ میں یہ مانے لیتا ہوں کہ اگر لوقا اور مارک (حضرت عیسیٰ کے حواریین) ایک دوسرے کی تردید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو یہ بھی مذہب کی صداقت کا ایک ثبوت ہے اور یہ کہ مذہب کی سچائی اور خوبی کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ وہ ناقابلِ فہم چیز ہے۔ ...... قصہ مختصر یہ کہ میں سب کچھ کہنے کو تیار ہوں بشرطیکہ مجھے چین سے بیٹھنے دیا جائے اور ایک ایسے شخص کے پیچھے نہ پڑا جائے جس نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا ہے۔"

والٹیر نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی مظلوموں کی امداد کے لئے، بیکسوں کی حفاظت کے لئے، بے گناہوں کو بچانے کے لئے، فرانس کے ظالمانہ قوانین کو منسوخ کرانے کے لئے، پادریوں کے دلوں کو نرم بنانے کیلئے منصفوں کو رحمدل کرنے کے لئے، عوام کو مہذب بنانے کے لئے اور لوگوں کے دلوں سے جنگ کی خواہش دور کرنے کے لئے!

کہا جا سکتا ہے کہ والٹیر کو خواہ مخواہ بہت بڑھا دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس موقع پر جرمنی کے مفکر اعظم "گوئٹے" کے الفاظ نقل کر دینا مناسب ہوگا۔ وہ لکھتا ہے کہ "اگر تم عمق، فراست، ذہانت، ذکاوت، تخیل، لطافت، فلسفہ، علو، فطرت، تنوع، شادابی، گرمجوشی، سحر، نزاکت، زور، عقل رسا، نازکخیالی، خلوص، پاک باطنی فصاحت، بلاغت، آب و تاب، چستی، تیزی، شوکت، رفعت، اور ترحم کو کسی ایک ہستی میں مجتمع دیکھنا چاہتے ہو تو والٹیر کو دیکھو"!

ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے زمانہ کی وہم پرستیوں کا خاتمہ کرے مگر پھر بھی ہزاروں باپ ماں ایسے پائے جاتے ہیں جو توہم پرستی کے تو مخالف ہوتے ہیں لیکن اپنے بچوں کے لئے اجازت دیدیتے ہیں کہ ان کے دماغوں میں، بیوقوف اُستاد وحشت و بہیمیت کا بیج بوتے رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لئے کوئی چیز اس سے زیادہ اہم نہیں کہ وہ آزاد رہے اور خوف سے بے نیاز!

ایک فانی مگر آزاد ہستی ہونا ایک غیر فانی غلام ہونے سے کہیں بہتر ہے!

اُس زمانہ میں خدا کے ماننے والے یہ کہا کرتے تھے کہ فطرت کی اسکیم میں ظلم و ستم کا عنصر نہیں ہے لیکن چونکہ ایک زندگی منحصر ہے دوسری زندگی پر اور ایک جانور زندہ رہتا ہے دوسرے جانور کی زندگی پر لہذا حیاتِ ادنیٰ کی قربانی حیاتِ اعلیٰ کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ ان دلایل پر اکثر لوگ مطمئن تھے مگر پھر بھی ہزاروں آدمی ایسے تھے جن کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ ادنیٰ اعلیٰ پر کیوں قربان کیا جائے۔ اور اب تو خوردبین کی امداد سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ ہمارے آبا و اجداد کا یہ نظریہ غلط تھا کیونکہ ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے جانوروں کی زندگی کو ان سے چھوٹے جانور ختم کر دیتے ہیں اور انھیں بڑے جانوروں کی حیات پر چھوٹے جانوروں کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ خود انسان بھی جراثیم کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کالرا، کے جراثیم کو دیکھو کہ وہ کتنے چھوٹے ہیں لیکن انسان کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ بعض ایسے کیڑے بھی پائے جاتے ہیں جن کی غذا قلبِ انسانی ہے، یا جو انسانی پھیپھڑا کھاتے ہیں یا جو آدمی کی قوت بینائی کا خاتمہ کر دیتے ہیں غرضکہ اسی طرح کے سیکڑوں ایسے کیڑے ہیں جو انسان کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اعلیٰ زندگی، ادنیٰ زندگی پر قربان ہو رہی ہے۔

کچھ عرصہ تک والٹیر، پوپ کی رجائیت (OPTIMISM) کا قایل رہا۔ مگر ۱۷۵۵ء میں جب ایک زبردست زلزلہ آیا تو رجائیت پسندوں کو مجبوراً یہ سوال کرنا پڑا کہ تمام دنیا پر رحم کرنے والے خدا نے سیکڑوں ہزاروں معصوم بچوں کو اسوقت جبکہ وہ اپنے گھٹنے اس کی بارگاہ نیاز میں ٹیکے ہوئے اُس کی حمد کے گیت گا رہے تھے کیوں تہ خاک کر دیا۔ اس واقعہ نے والٹیر کا مذہب بدل دیا اور اُسے یہ یقین ہوگیا کہ یہ دنیا بہترین دنیا نہیں کہی جاسکتی ـــــ خدا پرست، خاموش ہوگیا تھا! اور زلزلہ خدا کی ہستی سے انکار کر رہا تھا!

والٹیر کی انسانیت

اُس زمانہ میں ٹولوز مرجع خواص و عوام تھا۔ قدیم زمانہ کی اکثر یادگاریں کھنڈرول کی صورت میں یہاں موجود تھیں۔ یہاں کے لوگ جاہل مطلق تھے مگر ان کے پاس مذہب عیسوی کے ساتوں ولیوں کے خشک کپڑے کنواری مریم کے کسی لباس کا ایک حصہ، اور ان بیگانہ عقل لوگوں کی جنھیں "مقدس" کہا جاتا ہے سیکڑوں کھوپڑیاں موجود تھیں۔ یہ لوگ عیسویت کی فتح اور اس پر مظالم کے سلسلہ میں دو رسمیں بھی نہایت تزک و احتشام سے منایا کرتے تھے انھیں لوگوں میں کچھ گھر پروٹسٹنٹ مذہب رکھنے والے عیسائیوں کے بھی تھے مگر چونکہ تعداد میں کم تھے اس لئے بہت خاموشی سے زندگی بسر کرتے تھے ان میں سے ایک آدمی

جین کلاس نامی تھا۔ اس کے ایک بیوی، اور چھ لڑکے تھے اور بذاتِ خود وہ بہت نیک سمجھا جاتا تھا۔ سب سے بڑے لڑکے نے قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی لیکن فراغت کے بعد اس سے یہ کہدیا گیا کہ تاوقتیکہ وہ کیتھولک نہ ہو جائے گا اُسے یہ پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ اس پر اُس بیچارے نے یہ کوشش کی کہ کسی ترکیب سے یہ معلوم ہی نہ ہونے پائے کہ میں پروٹسٹنٹ ہوں اور مجھے لائسنس مل جائے مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر کار ایک دن نا اُمید ہو کر اُس نے اپنے باپ کے توشہ خانہ میں خودکشی کر لی۔ اس واقعہ کو سنکر ٹولوز کے متعصب باشندوں نے یہ افواہ پھیلادی کہ اُس کے والدین نے اسے خود ہی قتل کر دیا ہے تاکہ وہ کیتھولک نہ ہونے پائے۔ چنانچہ اس الزام میں لڑکے کے باپ، ماں، بھائی، ایک نوکر اور ایک مہمان کو گرفتار کر لیا گیا۔ مردہ لڑکے کو "شہید" تسلیم کر لیا گیا اور اُسکے جسم پر "چرچ" نے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ایک "مقدمہ" چلا۔ بجز سماعی شہادتوں کے قتل کی اور کوئی گواہی بھی نہیں ملی، اور واقعات ملزم کے موافق تھے مگر پھر بھی ۹ مارچ ۱۷۶۲ء کو غریب "مجرم" کے ہاتھ پاؤں زنجیروں اور رسیوں سے باندھ دئے گئے اور انہیں مخالف سمتوں کی طرف اتنا زور سے کھینچا گیا کہ جین کلاس کا ایک ایک عضو اکھڑ گیا۔ اس کے بعد اُس سے جرم کے متعلق پھر سوال کیا گیا مگر مجرم نے اقبالِ جرم سے انکار کیا۔ تب اُس کے پیٹ میں زبردستی منوں پانی اُنڈیل دیا گیا مگر مجرم برابر اپنے جرم سے انکار کرتا رہا۔ اس کے بعد اُسے ایک لکڑی میں باندھا گیا اور اُس کے ہر عضو کے دو دو ٹکڑے کئے گئے مگر "مجرم" نے اقبال نہ کیا۔ اس وقت وہ حالتِ نزع میں تھا مگر چونکہ دم نکلنے میں کچھ دیر تھی لہذا اُس کا گلا گھونٹا جانے لگا اور آخر کار اس طرح ایک بیگناہ نے اپنا دم توڑا۔ ٹولوز کے ظالموں کو اس پر بھی چین نہ آیا اور کلاس کے پسماندگان کے پاس جو جائیداد تھی اُسے ضبط کر لیا گیا، اس کے لڑکے کو اس شرط پر رہا کیا گیا کہ وہ عیسائی ہو جائے، ملازمہ کے سامنے یہ شرط پیش کی گئی کہ وہ ایک خانقاہ میں داخل ہو جائے۔ دونوں لڑکیوں کو بھی ایک خانقاہ بھیجدیا گیا اور غریب و بیکس بیوہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ دربدر بھیک مانگتی پھرے۔

والٹیر نے سارا قصہ سُنا تو اس کے بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے کلاس کے ایک لڑکے کو تو اپنی حفاظت میں لے لیا اور خود مقدمہ کی پوری روئداد لکھکر بادشاہوں، قانون دانوں اور مختلف ممالک کے ذمہ دار لوگوں سے اس مسئلہ پر خط و کتابت شروع کی جہاں روپیہ کی ضرورت ہوئی وہاں اُس نے روپیہ بھیجا جہاں خود جانا ضروری سمجھا وہاں خود گیا اور اپنی تحریروں سے سارے یوروپ میں زلزلہ ڈال دیا۔ بالآخر "مجرم" بے گناہ قرار دیا گیا اور اس کی بیوہ اور بچوں کے لئے ہزاروں روپیہ چندہ جمع ہو گیا۔ یہ تھی والٹیر کی خدمت نوعِ انسانی کے لئے۔

خاندان سروِن کا قصہ

سروِن نامی ایک پروٹسٹنٹ لنگویڈاک میں رہتا تھا۔ بیوی کے علاوہ اُس کے تین لڑکیاں تھیں وہاں کے پادری نے یہ چاہا کہ ان میں سے ایک لڑکی کو وہ کیتھولک بنالے۔ قانون کی رو سے بچہ کی روح کو نجات دلانے کے لئے ایک پادری کو حق حاصل ہوتا تھا کہ بچہ کو اس کے والدین سے چھین لے، چنانچہ سروِن کی ایک چھوٹی لڑکی کو اُس سے جدا کر کے خانقاہ میں بھیج دیا گیا مگر وہ لڑکی گھر بھاگ آئی اور یہاں دیکھا گیا کہ اُس کی پشت کوڑوں کی مار سے لہولہان ہے۔ اس کے بعد ہی ایک دن لڑکی اپنے گھر سے پھر غائب ہوگئی اور مکان سے تین میل کے فاصلہ پر اس کی لاش پائی گئی۔ پادریوں کی طرف سے شور مچایا گیا کہ لڑکی کے اعزہ نے اُسے کیتھولک ہونے سے بچانے کے لئے قتل کر ڈالا ہے۔ یہ واقعہ بھی اُسی زمانہ میں ہوا جب جین کلاس پر مقدمہ چل رہا تھا۔ سروِن مع اپنے اہل و عیال کے بھاگا کہ اگر مقدمہ چلا تو ہم میں سے کسی کی خیر نہیں مگر سروِن کے بھاگ جانے کے باوجود اُس کی عدم موجودگی میں اُس کے خاندان بھر پر مقدمہ چلایا گیا مقتول لڑکی کے باپ اور ماں کو پھانسی کی سزا دی گئی اور بقیہ دو لڑکیوں کو جلاوطنی کی۔

اب ان غمزدوں کا بیان سنئے۔ یہ سب کڑکڑاتے جاڑے میں بھاگے تھے، سروِن کی بڑی لڑکی جس کی شادی ہو چکی تھی حاملہ تھی اور وضع حمل کا زمانہ قریب تھا۔ چنانچہ آلپس کی برفانی چوٹیوں پر اُس کے بچہ پیدا ہوا، ماں مصیبتوں کی تاب نہ لا کر مر گئی۔

والٹیر کو جب یہ حال معلوم ہوا تو ان کی دستگیری کے لئے بھی اس نے اپنا ہاتھ اور قلم بڑھایا اور اس فیصلہ کے خلاف وہ دس برس تک لڑتا رہا، اُس نے بادشاہوں سے چندہ کی اپیل کی اور آخر کار دسویں برس اُسے کامیابی حاصل ہوئی ـــــ یہ تھا والٹیر کا جذبۂ محبت نوعِ انسانی کے لئے۔

اسپنیس کا واقعہ

اسپنیس ایک کھاتا پیتا پروٹسٹنٹ عیسائی تھا۔ ۱۷۴۰ء میں اُس نے اپنے گھر میں ایک پروٹسٹنٹ پادری کو ٹھہرایا اور اُس کو کھانا بھی کھلایا مگر چونکہ ملک کے قانون کے مطابق یہ فعل گناہ عظیم تھا لہٰذا اسپنیس کو حبس دوام کی سزا ہوگئی۔ والٹیر کو ۲۳ برس کے بعد یہ حال معلوم ہوا اور اُس کی مساعی

کی بدولت اسپنیس کو رہائی ملی۔

غرضکہ اسی طرح کی سیکڑوں ایسی مثالیں ہیں جن میں والٹیر نے بیواؤں، یتیموں، بیکسوں اور مظلوموں کی امداد کی۔ یہاں سب کی تفصیل بتانا مشکل ہے صرف ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے:-

۱۷۶۵ء میں بہ مقام ابول، ایک پل پر صلیب نما دو لکڑیاں لگی تھیں ایک دن ان کو کسی نے چاقو سے چھیل دیا۔ دو نوجوانوں، اشویلیر لابری اور ڈی اٹلونڈی پر شک ہوا۔ موخرالذکر نے تو جرمنی بھاگ کر اور فوج میں بھرتی ہو کر جان بچائی اور مقدم الذکر پر مقدمہ چلا۔ دونوں کے خلاف شہادت کوئی بھی نہ تھی مگر جو حکم سنایا گیا اس میں سزا کی تعیین اس طرح کی گئی تھی:-

(۱) زبانیں گدی سے کھینچ لی جائیں

(۲) گرجا گھر کے دروازہ پر ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔

(۳) لوہے کی زنجیروں میں باندھ دئے جائیں اور پھر بدن میں آگ لگا دی جائے۔

مقدمہ کی اپیل کی گئی۔ جس کی سماعت ۲۵ ججوں نے کی مگر عدالت ماتحت کا فیصلہ بحال رہا۔ اور یکم جولائی ۱۷۶۶ء کو حکم کی تعمیل بھی ہو گئی۔

جب والٹیر کو اس سزا کا حال معلوم ہوا تو اُس نے فرانس کو، جہاں ایسے مظالم ہو سکتے تھے، عمر بھر کیلئے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ پہلے تو اُس نے ایک پمفلٹ لکھا جس میں واقعات مقدمہ مندرج تھے۔ پھر اٹلونڈی کا پتہ لگایا اور شاہ جرمنی سے سفارش کر کے اُس کا نام فوج سے کٹایا اور اسے اپنے پاس ڈیڑھ برس تک رکھ کر ریاضی ڈرائنگ اور انجینیرنگ کے فنون سکھائے یہاں تک کہ اٹلونڈی، فریڈرک اعظم کی فوج میں انجینیر ہو گیا۔

والٹیر بیکسوں اور مظلوموں کا حامی تھا اور ایک عظیم الشان بلندی سے دنیا کو دیکھتا تھا۔ وہ بہشت کے دروازہ سے اوہام کی فوج کو نکالنا چاہتا تھا تاکہ آدم کی اولاد شجر علم کے ثمر کا مزہ چکھ سکے۔ مگر پادری اس کی مخالفت کرتے تھے کیونکہ وہ شجر جہالت کے پھل فروخت کرتے تھے جہاں تک اصول کا تعلق تھا وہ اپنے عہد کا بہترین قانون داں تھا۔ وہ قانونی اصطلاحات اور فیصلے نہیں جانتا تھا مگر یہ سمجھتا تھا کہ قانون کو کیسا ہونا چاہئے اور اسکا نفاذ کیسے کرنا چاہئے۔ وہ گواہی کے فلسفہ کو سمجھتا تھا، شک اور ثبوت کا فرق جانتا تھا اور اُس نے اپنے عہد کے تمام مدبرین اور تمام قانون دانوں سے زیادہ ملک کے قوانین میں اصلاح کی۔ وہ زمانۂ طالبعلمی میں دنیا کے بہترین مقررین سیسیرو کی کتابیں پڑھ چکا تھا اور انسانی مساوات کا علمبردار تھا۔ وہ کہتا تھا کہ:-

"تمام انسان برابر پیدا ہوئے ہیں ــــــ اور ــــــ ہم کو نیک صفات اور قابلیت کی قدر کرنا چاہئے۔

وہ غلامی کا، خواہ وہ کسی صورت میں ہو، سخت مخالف تھا۔ اُس کا خیال یہ نہ تھا کہ ایک انسان کا رنگ اُسے اس امر کی اجازت دیتا ہے کہ دوسرے انسان سے اُس کے رنگ کی بنا پر وہ کوئی چیز چوری کرلے۔ وہ غریبوں اور کسانوں کا دوست تھا اور اُس نے بچوں، عورتوں اور جانوروں کو ان لوگوں کے ظلموں سے ہمیشہ بچایا جنھیں اپنے ہمسایوں سے اتنی ہی محبت کا دعویٰ تھا جتنا وہ خود اپنے سے کرتے ہیں۔

وہ اس چیز کو مہمل خیال کرتا تھا کہ خدا باپوں کو تو غرق کردے اور پھر بچوں کے واسطے خود اپنی جان دیدے اس کا یہ خیال ڈیڈیرآٹ کے اس قول کے بالکل موافق تھا کہ " اگر عیسیٰ کو یہودیوں سے بچنے کی قدرت تھی اور پھر بھی اپنے کو نہ بچایا تو وہ خودکشی کے مجرم تھے"۔

والٹیر ظالموں سے نفرت کرتا تھا اور حکومتوں اور پادریوں کے مظلوموں سے محبت۔ وہ بدقسمتوں کا دوست اور فاقہ کشوں کا مددگار تھا۔ وہ فطری چیزوں کا معتقد اور مہملات کا دشمن تھا۔

والٹیر کوئی ولی نہ تھا مگر مذہبی جھگڑوں پر وہ ہنستا تھا، عقاید پر اُسے رحم آتا تھا اور متعصبوں کی حرکات پر متنفر۔ وہ ولیوں سے بڑھکر تھا!

والٹیر کے زمانہ میں اکثر عیسائی اپنی روزمرہ کی زندگی میں مذہب کی پیروی نہیں کرتے تھے بلکہ جس طرح طوفان کے وقت جہازوں میں جان بچانے والی کشتیوں سے کام لیا جاتا ہے اُسی طرح مصیبت کے وقت مذہب سے وہ لوگ بھی کام نکالنا چاہتے تھے۔ والٹیر، انسانیت اور اعمال حسنہ کے مذہب کا معتقد تھا۔ صدیوں تک پادریوں نے معائب اور برائیوں کو ایسے رنگ میں رنگا تھا کہ گناہ بھی خوبصورت نظر آتا تھا۔ مگر والٹیر خوبی کے محاسن اور اوہام پرستی کے معائب کا معلم تھا۔

والٹیر اپنے عہد کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار یا شاعر نہ تھا مگر وہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا انسان، حریت کا سب سے بڑا دوست اور وہم پرستی کا سب سے بڑا دشمن ضرور تھا۔ اُس نے اوہام پرستی کی زنجیروں کو توڑنے، دل و دماغ سے خوف کے بادل دور کرنے، پادریوں کے اختیارات ختم کرنے اور دنیا کو آزادی دلانے کے لئے ابنائے آدم میں سے سب سے زیادہ کام کیا۔ اور صحیح معنیٰ میں وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا مذہب پرست تھا۔

واپسی — ۲۷ برس جلاوطن رہنے کے بعد والٹیر پیرس واپس ہوا۔ اس دوران میں مہذب دنیا میں وہ نہایت اعلیٰ پوزیشن کا مالک رہا اور اُس کی واپسی ایک فاتحانہ شان رکھتی تھی اُسکا ایک شہنشاہ کی طرح سے استقبال کیا گیا۔ اکاڈمی نے اُس کا خیر مقدم کیا جو عزت بادشاہوں کو بھی کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ تھیٹر میں اس کا تماشہ "آئرین" دکھلایا گیا اور وہاں اُس کو پھولوں سے لاد دیا گیا۔ وہ فرانس کا بہترین شاعر

مانا جانے لگا۔ دنیا کے تمام ادیبوں میں اس کا درجہ سب سے بلند تھا۔ اور اُس وقت فرانس میں صرف تین قوتیں سمجھی جاتی تھیں تخت شاہی، قربانگاہ اور والٹیر!

بادشاہ اُس کا مخالف تھا۔ پادری اُس سے جلے ہوئے تھے مگر والٹیر کا عوام پر اتنا اثر ہو چکا تھا کہ وہ اکی پرستش کرتے تھے۔ اس وقت اس کی عمر ۸۴ برس کی تھی۔ اُس کے چہار طرف سیم وزر کے انبار لگے تھے وہ دنیا کا نہایت دولتمند انشا پرداز تھا۔ وہ ایک ایسا بادشاہ تھا جس نے خود اپنا تخت بنایا تھا۔

مئی ۱۷۷۸ء میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ والٹیر مرنے کے قریب ہے۔

مرنے سے دو روز قبل والٹیر کا بھتیجا اس کے بستر مرگ پر دو مشہور پادریوں کو لے آیا۔ ایک پادری نے اُس سے آکر پوچھا کہ کیا تم اب بھی حضرت یسوع مسیح کی الوہیت کا اقرار کرتے ہو۔ والٹیر نے دوسری طرف منھ کرکے جواب دیا کہ "مجھے اطمینان سے مرنے دو" پادری صاحبان منغض ہو کر باہر چلے گئے۔

۳۰ مئی ۱۷۷۸ء کو رات کے تقریباً سوا گیارہ بجے والٹیر اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ مرنے سے کچھ لمحے قبل اُس نے اپنے معتمد آدمی مورانڈ کا جو پاس ہی کھڑا تھا ہاتھ دبایا اور کہا ۔۔۔ "رخصت، مائی ڈیر مورانڈ۔ میں چلا!"

اس کی اس موت کو جو اسقدر سادہ، سنجیدہ، فلسفیانہ، نازک، فطری اور پر سکون تھی اور اس کے ان الفاظ کو جو اتنے ہی سادے اور معصومانہ تھے عجیب وغریب رنگ میں پیش کیا گیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مرتے وقت اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا اور عذاب خداوندی اس پر نازل ہو رہا تھا۔

لیکن آیئے ذرا ایمانداری سے یورپ کے پادریوں اور یورپ کے مشہور مفکرین کا مقابلہ کریں۔ کیا اٹلی کے تمام پادریوں نے برونو سے زیادہ انسانی عقل میں اضافہ کیا ہے؟ ۔ کیا فرانس کے تمام پادریوں نے والٹیر یا ڈڈیراٹ سے زیادہ دنیا کو مہذب بنایا ہے؟ کیا اسکاٹلینڈ کے تمام پادریوں نے ہیوم سے زیادہ علم کی اشاعت کی ہے؟ کیا دنیا کے پادریوں نے ٹامس پین سے زیادہ انسانی آزادی کے لئے کوشش کی ہے؟ ۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہ "ملحدین" نہ ہوتے تو دنیا کیا ہوتی؟ ۔۔۔ "ملحدین" ہمیشہ بہادر اور خوش فکر ہوئے ہیں، گلشن عالم میں ان کی حیثیت گلاب کی سی رہی ہے، وہ آزادی اور محبت کے علمبردار تھے اور ان کی ہستیاں عظیم المرتبت روحوں کی مالک تھیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ لوگ جنھوں نے ابنائے آدم کی آزادی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہو، ان کو تو مرتے وقت ضمیر کے سانپ ڈسنے لگیں اور وہ نفوس مقدسہ جنھوں نے غلامی کی تائید کی ہو، جنھوں نے

ماؤں کی چھاتیوں سے ان کے معصوم بچوں کو چھین لیا ہو، جنھوں نے غلاموں کی ننگی پیٹھوں کو کوڑوں سے لہولہان کر دیا ہو وہ مرتے ہی فرشتوں کی آغوش میں چلے جائیں! ہم یہ کیونکر یقین کر سکتے ہیں کہ دنیا کے مفکرین و محققین، آزاد خیال، انسانیت پرست، تعصب کی زنجیروں کے توڑنے والے، علم کی روشنی پھیلانے والے اور اوہام پرستی کے بت کو توڑنے والے تو تکلیف کی موت مریں اور وہ لوگ جو انسانی پوست کو ہڈی سے جدا کیا کرتے تھے، جو دوشیزاؤں ماؤں اور بچوں کو مول سے لیکر زدوکوب کیا کرتے تھے وہ سب امن اور سکون کے عالم میں اس دنیا سے گزر جائیں۔

اُس زمانہ میں فلسفیوں اور مفکرین کے لاشوں کو بھی زیر زمین دفن کرنے کی اجازت نہیں ملتی تھی کیونکہ خطرہ یہ تھا کہ ان لوگوں کی ہڈیاں نیک لوگوں کی ہڈیوں میں مل کر ان کو ناپاک بنا دیگی اور ممکن ہے کہ قیامت کے روز گڑبڑ میں یہ خراب لوگ بھی نیکوں کے ساتھ ملکر جنت میں چپکے سے گھس جائیں لہذا جب کوئی فلسفی مرتا تھا تو اس کی لاش جلا دی جاتی تھی یا اسے درندوں کے سامنے ڈال دیا جاتا تھا اور یا کسی ایسی جگہ دفن کرنے کی اجازت ملتی تھی جہاں آس پاس نیکوں کے مزار نہ ہوں۔

جب والٹیر کا انتقال ہوا تو ایک پادری نے پیرس سے سو میل کے فاصلہ پر ایک گرجا میں اُسے دفن کرنے کا انتظام کر دیا۔ مئی کے آخری روز اتوار کے دن اس کی لاش کو ڈریسنگ گاؤن اُڑھا کے چھ گھوڑوں کی ایک گاڑی پر رکھا گیا تاکہ یہ معلوم ہو کوئی بڑا آدمی کہیں جا رہا ہے اس گاڑی کے پیچھے ایک اور گاڑی تھی جس میں اس کے دو تین اعزہ تھے۔ رات بھر سفر کرنے کے بعد لاش اس گرجا میں پہونچی اور والٹیر کو دفن کر دیا گیا مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد اُس پادری کے پاس جس نے "بہ نظر ترحم" زمین کا ایک ٹکڑا دیدیا تھا، بڑے پادری کی طرف سے ایک عتاب نامہ پہونچا کہ والٹیر کو دفن نہ کرنے دیا جائے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے ہر چند والٹیر مر چکا تھا مگر قصر شاہی کی بنیادیں منہدم ہو چلی تھیں۔ عوام بادشاہوں اور پادریوں کی کرتوتوں سے واقف ہو چکے تھے۔ اور انتقام و ظلم کے عفریت کی جگہ اب امن و آزادی کے فرشتے لے رہے تھے۔

اگر "چرچ" کے اُصول کو صحیح سمجھا جائے تو ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ بجز "ملحدین" کے اور تمام مجرم مقابلۃً زیادہ سکون سے ہیں۔ اگر کوئی شخص ڈاکو ہے تو اس کی موت سے اس کے پیشہ کا کوئی تعلق نہیں، اگر کسی قاتل کے پاس مرتے وقت ایک پادری موجود ہے تو جنت میں نیک بندے اس کا استقبال کرنے کے لئے کھڑے ہوں گے۔ جس شخص نے دنیا میں اپنے گھر کو دوزخ بنا لیا تھا وہ بھی بغیر کسی جھجھک کے مر سکتا ہے بشرطیکہ اُس نے عیسیٰ کی الوہیت پر کبھی نہ شک کیا ہو۔ وہ بادشاہ جس نے ناحق لڑائیاں لڑکر ملک کو یتیموں اور بیواؤں اور اپاہجوں اور محتاجوں سے بھر دیا ہو وہ ایک ولی اللہ کی طرح جان دیتا ہے۔ عیسیٰ پر ایمان

رکھنے والے جتنے بادشاہ ہیں وہ جنت میں ہیں مگر جتنے فلسفی ہیں وہ دوزخ میں ہیں۔ وہ ظالم جن کے نام ہی ان کے مظالم کی شہادت کے لئے کافی ہیں نیک بندوں کی موتیں مرے ہیں کیونکہ ان کا بپتسمہ ہوگیا تھا اور انھوں نے عیسٰی کی الوہیت سے انکار نہیں کیا تھا۔ لوگوں میں یہ عقیدہ پیدا کر دیا گیا تھا کہ اگر بادشاہ اور پادری بے گناہوں کو بھی زندہ جلا ڈالیں تو اس وقت تک خدا ان سے باز پرس نہ کرے گا جب تک وہ اس کو مانتے ہیں۔ لیکن اگر کسی ایماندار اور صداقت پرست نے "الہامی الفاظ" پر شک کیا یا کسی دوسرے خدا سے دعا مانگ لی تو حقیقی خدا ایک زخم خوردہ شیر کی طرح اپنے شکار پر چڑھ بیٹھے گا اور اس کے مرتعش جسم سے اس کی روح کھینچ لیگا۔

دنیا میں اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے کہ قتل کے لئے اٹھا ہوا ہاتھ مفلوج ہوگیا ہو، دنیا میں اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا کہ کسی بے گناہ بچہ کو خدا نے عین موقع پر بچا لیا ہو۔ ہزاروں گناہ روزانہ کئے جاتے ہیں، سیکڑوں انسان اپنے شکار کی تلاش میں لگے رہتے ہیں، بیواؤں کو کوڑے لگائے جاتے ہیں اور لوگ مارتے مارتے ان کی جانیں لے لیتے ہیں، چھوٹے بچے اپنے خونخوار باپوں سے رحم کی بھیک مانگتے ہیں مگر ان کی درخواستوں اور ان کی التجاؤں کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ حسین اور معصوم لڑکیوں کو دام تزویر میں پھانس کر ان کی عزت برباد کر دی جاتی ہے مگر خدا ان مظالم کو نہیں روکتا۔ پھر دنیا میں کبھی کبھی ذی فہم ایماندار انسان بھی پیدا ہوئے جو اپنے زمانہ کی اوہام پرستیوں کو دور کرنا چاہتے تھے۔ مگر پادریوں کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ تھا اور اس لئے ان پر مقدمے چلائے جاتے تھے اور ان کو سخت سے سخت سزا دی جاتی تھی۔ اگر اتفاق سے کوئی اپنی طبعی موت سے مرا تو پادری کہا کرتے کہ وہ نہایت سختی کی موت مرا ہے۔

پادریوں نے یہ ثابت کرنے کی انتہائی کوشش کی ہے کہ ملحدین کے آخری لمحات نہایت تکلیف دہ گزرے ہیں اور اسکی تلقین گرجا کے ہر ممبر سے کی جاتی ہے مگر اس کو تسلیم کرنے کے بجائے والٹیر نے انجیل کی جانچ کی عقلی آزادی کی وکالت کی، استبداد پسند مذہب کی زنجیروں کو توڑا، مظالم کے خلاف آواز بلند کی، عقل اور دلایل کے نام پر اپیل کی، عالمگیر رواداری پر زور دیا اور مظلوموں کی امداد کی۔

اس نے صرف یہ کہا کہ ہر مذہب کی اصل ایک ہی ہے — ہر مذہب میں وہی اسرار ہیں، وہی معجزے وہی کرامات، وہی خرق عادات، وہی مندر، وہی مراسم، وہی وعدے، وہی دھمکیاں وہی مظالم اور وہی جور و تعدی۔

والٹیر کے یہی جرائم تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کے لئے یہ کیونکر کہا جا سکتا تھا کہ اس نے سکون کے عالم میں اپنی جان دی۔ چنانچہ صدیوں سے اہل مذہب یہی تعلیم دیتے چلے آرہے ہیں کہ جن لوگوں نے ہمارے مذہب

کی تعلیمات پر لبیک نہیں کہا ہے اور اس کی کورانہ تقلید نہیں کی، مرتے وقت ان کو ہمیشہ تکلیف ہی رہی جب کبھی پادری حالت نزع کو بیان کرنے لگتا ہے تو اس کی فصاحت و بلاغت انتہا کو پہونچ جاتی ہے اور وہ جب ایک مرتے ہوئے ملحد کی آخری حالت بیان کرتا ہے، تو اُس کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ اور جب اس پر بھی اطمینان نہیں ہوتا تو عذاب جہنم کی داستانیں سنائی جاتی ہیں۔

دوسری واپسی — چار سو برس تک بیسٹائل، مظالم کا مرکز بنا رہا۔ اس کی چہار دیواری میں سیکڑوں شریف انسان موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ اس کے قید خانے اور اُس کے آلات تعذیب خدا کے وجود سے انکار کر رہے تھے۔ مگر ۱۴ جولائی ۱۷۸۹ء کو مظلوم عوام نے بیسٹائل پر حملہ کرکے اُسے فتح کر لیا۔ ان کا نعرہ والٹیر تھا! ۱۷۹۱ء میں اس کی اجازت ملی کہ والٹیر اب یہاں دفن کیا جا سکتا ہے۔ وہ پیرس سے ۱۱۰ میل پر خاموشی سے دفن کر دیا گیا تھا مگر اب اُسے پوری قوم یہاں لا رہی تھی۔ جنازہ کا جلوس ۱۰۰ میل لمبا تھا۔ ہر گاؤں اپنا جھنڈا لئے جنازہ کے ساتھ تھا اور ہر شخص فرانس کے فلسفی، جین کلاس کے بچانے والے اور اوہام پرستی کے برباد کرنے والے کے حضور میں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے بیتاب تھا۔

اگر واقعی موت کے بعد کوئی زندگی ہے تو کوئی خدا اُس شخص کو سزا نہیں دے سکتا جس نے اس دنیا سے سزاؤں کو مٹایا ہے اور اُس شخص کو کبھی نہیں قید کر سکتا جس نے غلامی کی زنجیروں کو یہاں توڑا ہے۔

والٹیر فرانسیسی زبان کا زبردست ماہر تھا اور ہر خیال کے لئے بہتر سے بہتر الفاظ ڈھونڈھ لیتا تھا۔ اہم سے اہم اور دقیق سے دقیق مسئلہ پر وہ نہایت آسانی سے لکھتا تھا۔ ہجو اور مدح پر ایسا قادر تھا کہ ایک ہی جملہ میں دونوں چیزیں آجاتی تھیں۔ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات اور اہم سے اہم مسائل کو اس طرح پیش کرتا تھا جیسے کوئی بازیگر اپنے گیند کا تماشہ دکھاتا ہے۔ وہ رموز دنیا سے واقف تھا۔ ظلم سے نفرت کرتا تھا، مظلوموں کا ساتھ دیتا تھا، اوہام پرستی کا دشمن تھا اور آزادی کا عاشق۔ یہ تھا والٹیر جس نے سترہ برس کی عمر میں اوڈی پس OEDIPUS لکھا اور ۸۳ برس کے سن میں آئرین IRENE

آلپس کے دامن میں اپنے تخت جلال سے اُس نے یورپ کے ہر ریاکار پر انگشت نمائی کی اور نصف صدی تک وہ عقل کی شمع دنیا کو دکھاتا رہا۔

اگر آپ روحانیات سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو "جن" کے پرچے مطالعہ کیجئے
فی پرچہ اصل قیمت ۴/ — رعایتی ۱/ علاوہ محصول — منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

حضرت ۔ یہ آپ کس زمانہ کی باتیں کر رہے ہیں ۔ آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ "قالوا بلیٰ" کہنے والوں میں میری روح بھی شامل تھی ۔ "لن ترانی" کی توہین برداشت کرنے والے کب کے ختم ہو چکے ۔ اور اس وقار و خودداری کے دور کو بھی ساڑھے تیرہ سو برس سے زیادہ زمانہ گزر چکا ۔ مگر آپ ہنوز "وادیِ ایمن" کا خواب دیکھ رہے ہیں ۔ یعنی

اگر شراب نہیں ، انتظارِ ساغر کھینچ ـــــــــ معقول !

قبلہ ، طاعت و عبادت کا مفہوم اگر صرف یہ ہے کہ پیشانی رگڑ رگڑ کر تقدیر کے لکھے کو مٹایا جائے (حالانکہ آپ اس کے بھی قایل نہیں) تو یہ "گھس گھس" میرے بس کی بات نہیں ۔ لیکن اگر اس سے مقصود کوئی "استغراقِ روحانی" بھی ہے تو مجھے بتائیے کہ اس کا انحصار "تسبیح و مصلا" "ریش و بروت" پر کیوں ہو ؟

درکارِ عشق نالہ و آہے ضرور نیست

میں سمجھا کہ یہ بدگمانی آپ کو کیوں پیدا ہوئی ۔ برسوں کے بعد آپ نے مجھے دیکھا اور ایسی صورت میں جس کی توقع آپ کو نہ تھی ۔ "توقع" کا لفظ میں نے غلط استعمال کیا "اندیشہ" کہنا چاہئے ـــ بہتر ہے آیندہ کبھی حاضری کی فرصت نصیب ہوئی تو کوشش کروں گا کہ آپ کا جذبۂ زیارتِ "موئے مبارک" بھی پورا ہو جائے ۔

مکرمی ۔ یاد فرمائی کا شکریہ ، میں اس دوران میں بہت کم یہاں رہا ۔ اسی لئے عریضہ پیش کرنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی ۔ معذرت خواہ ہوں ۔

ڈاکٹر صاحب حیدر آباد ہی میں ہوں گے ۔ کئی مہینے ہوئے ایک خط آیا تھا ، ایران جانے کی طیاریاں کر رہے تھے اور مجھے بھی "دعوتِ ہوا و ہوس" دے رہے تھے ، لیکن غالباً ابھی اس ارادہ کی تکمیل نہیں ہو سکی ، ورنہ ضرور اطلاع دیتے ۔

ہاں، علیگڈھ نہیں جاسکا، طبیعت بدمزہ تھی - اور اچھا ہوا کہ میں وہاں نہیں گیا۔
محض "اثبات وجود" سے کیا ہوتا ہے۔۔ اصل چیز "اضطرابِ حیات" ہے سو وہ اس قوم سے مفقود ہوچکا ہے۔

فرصت زدست رفتہ و حسرت فشردہ پائے

کیا آپ نمائش میں تشریف نہ لائیں گے۔ کام کی بات ہو یا نہ ہو، لیکن اپنے آپ کو کھو دینے کے لئے رنگینیوں کی کمی نہیں۔ منتظر ہوں۔

عزیزم - "شاعر" سے یہ مطالبہ کہ وہ کوئی پیغام بھی دنیا کو پہونچائے، بالکل جدید چیز ہے، خاص کر اس صدی میں جب کہ "ریاضی" ہر چیز کے حدود متعین کرنا چاہتی ہے - آپ کا فرمانا درست ہے کہ پہلے شاعر کو، مرفوع القلم و مسلوب الحواس سمجھ کر انسان صرف اس کی باتوں پر ہنسا کرتا تھا اور وہ بھی جو اسکے منھ میں آتا تھا کہہ گزرتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ بیکار نہیں گیا، شاعر کی یہی دیوانگی آہستہ آہستہ لوگوں میں فرزانگی پیدا کررہی تھی، یہاں تک کہ زمانہ کا رخ ادھر سے اُدھر ہوگیا اور دنیا وہی کہنے لگی جو شاعر کہتا تھا۔
اب تو خیر مذہب ختم ہورہا ہے، مگر اُسوقت بھی جب اس کا "بطشِ شدید" عام تھا، شاعر اتنا ہی آزاد تھا۔ پھر لوگ یہ سب کچھ سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے ۔ خوش ہونا تو معمولی بات ہے رفتہ رفتہ ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی جو اس پر سر دھنتی تھی۔
آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن میں تو یہی کہوں گا کہ اس باب میں قدیم شاعر کی خدمات بہت عظیم الشان ہیں۔ آپ "پیام" لئے پھرتے ہیں، میں کہتا ہوں اس نے "کام" کیا ہے، کام۔
بات یہ ہے کہ آزادی انسان کا فطری حق ہے اور ہر وہ بات جو آزادی سے متعلق ہو انسان کو ہمیشہ اچھی معلوم ہوگی - اس میں اب اور جب کی قید نہیں۔
کیا آپ کو حیرت نہیں ہوتی کہ دنیا نے ـــ خواہم کہ دگر بت کدہ سازند حرم را ـــ کے باغیانہ درس کو سنا اور واہ واہ کی۔
ایک تنقید اور ملاحظہ ہو:

صد کعبہ خلیل گو بنا کن
کفارۂ بت شکستنی نیست

اس سے زیادہ پیام آپ اور کیا چاہتے ہیں۔

عزیزمن

اس دوران میں آپ کے دو خط ملے، ایک تصویر کی طلب میں، دوسرا رسید کی صورت سے۔ میں نے آپ کے پہلے خط کا جواب نہیں دیا اور جو وجہ اُس وقت مانع تھی، اب بھی ہے، لیکن اس خیال سے کہ معلوم نہیں آپ اس کی کیا توجیہ کریں، نیز اس مصلحت سے کہ اس وجہ کا علم آپ کو بھی ہو جانا ضروری ہے، یہ عریضہ پیش کر رہا ہوں۔

میرے عزیز دوست، ایک جماعت کی بقا کا انحصار صرف اسکی تہذیب کی بقا پر ہے اور اس میں سب سے نمایاں چیز زبان ہے۔ حیرت ہے کہ آپ میرے ساتھ اتنی خوش عقیدگی رکھتے ہیں لیکن اس کا اظہار فرماتے ہیں ایسی زبان میں جو نہ میری ہے نہ آپ کی۔ پھر با اینہمہ شیفتگی و نیازمندی آپ اس کو ٹائپ کرکے بھیجتے ہیں، درانحالیکہ ایک ایسے شخص کو جسے انگریزی لکھنے کا اتنا شوق ہو، یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ دوستانہ مراسلت میں ٹائپ کا استعمال خلاف تہذیب ہے۔

میں آپ کی محبت کا معترف ہوں اور شرمسار ہوں کہ بہ اندازۂ جذبات اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتا کاشکے مجھے آپ کی زندگی و مشاغل زندگی کے مفصل حالات معلوم ہوتے تاکہ میں آپ سے زیادہ کھل کر باتیں کر سکتا، امید ہے کہ میری تحریر کی تلخی ناگوار نہ ہوگی

معقول! آپ اپنے اخلاق کے متعلق میری رائے دریافت فرماتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ۔

دراں دیار کہ زادی ہنوز آنجائی

تم کافر پیدا ہوئے اور کافر ہی مروگے۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہئے۔۔ دیکھو مذاق میں سچی بات کہنا سخت خطرناک امر ہے۔ تم اس باب میں بہت آزاد واقع ہوئے ہو اور میں ہمیشہ اس پہلو کو بچاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میر صاحب سے تمھارا جھگڑا کس بات پر ہوا، پھر کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ان کے مقابلہ میں تم ایسے شریر انسان کا ساتھ دوں گا۔ وہ ملیں تو ان سے کہہ دینا کہ تمہارے متعلق میری رائے صرف یہ ہے کہ

خوئے تو الفت گداز، نازِ تو دشمن نواز،
صلحِ تو دیر آشتی، جنگِ تو زود آشنا

دیکھو آئندہ کبھی ایسی جسارت نہ کرنا کہ خود ہی گناہ کرو اور خود ہی اس کی توثیق چاہو،

ہوش میں آؤ، یہ کیا کہہ رہے ہو، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔ مرد پیدا ہوئے ہو تو مردوں کا سا ظرف بھی رکھو

یہ ذرا ذراسی بات میں عورتوں کی طرح منھ پر آنچل ڈال کر ٹسوے بہانا مجھے پسند نہیں۔

عشق منت می نہد آنرا کہ رسوا می کند

گھر کے بڑے بنے ہو تو یہ سب کچھ سہنا پڑے گا۔ اعزہ کی طرف سے یہ حسنِ سلوک کوئی نئی بات نہیں۔ مگر یہ فخر تم سے وہ کبھی نہیں چھین سکتے کہ تم ان کے مربی و محسن ہو۔ ان کو بکنے دو، اور دنیا کی پرواہ نہ کرو۔ اچھا کام خود اپنی جزا ہے، اور انسان کا یہ احساس کہ وہ اپنا فرض انجام دے رہا ہے اس کی جنت ہے۔

اگر زندگی میں یہ تلخیاں نہ ہوں تو دنیا رہنے کی جگہ نہ رہے۔ تم بروں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کروگے تو تم میں ان میں فرق ہی کیا رہے گا۔ کیا تمھیں وہ حکایت یاد نہیں کہ کسی حکیم سے پوچھا گیا:۔

"ادب از کہ آموختی۔ گفت: از بے ادباں"

آئندہ یہ شکوہ و شکایت تم سے نہ سنوں ـــــ "غنچہ شو دامنِ آرام بہ چنگ ست اینجا"

کرمفرمائے نیاز منداں، گرامی نامہ نے معزز فرمایا۔ فارسی تغزل کے باب میں آپ سے بہتر سند اور کیا ہو سکتی ہے۔ آپ میری عزت بڑھاتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے، میں کیا اور میری رائے کیا۔ آپ سے غالباً یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ میں قدامت پرستی کا دشمن ہوں، لیکن اسی کے ساتھ آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ جس حد تک تغزل کا تعلق ہے میں قدامت کا پرستار ہوں۔

نظیری، حافظ اور عرفی اس میں شک نہیں "غزل" کے بادشاہ ہیں، لیکن رات کی تنہائیوں اور پچھلے پہر کے سکوت میں، سوائے سعدی کے مجھے کوئی یاد نہیں آتا، ہندی نژاد شعراء میں خسرو کے تغزل کا اسی لئے دلدادہ ہوں کہ اس کے کلام سے بھی وہی "بوئے خوشدلی" آتی ہے۔

یوں ادب و انشاء میں میرا ذوق کافی دقت پسند ہے، لیکن غزل میں جہاں کوئی اشکال پیدا ہوا اور مجھے اُلجھن ہوئی۔ صاف و سہل الفاظ، سلجھا ہوا انداز بیان، شگفتہ ترکیبیں۔ یہ ہیں ایک غزل کی خصوصیات اور فارسی شعراء میں سعدی کے یہاں یہ رنگ اتنا ہی رچا ہوا ہے جتنا اُردو میں میر کے یہاں۔

محبوب کے لئے جان دیدینا، بہت عامۃ الورود خیال ہے اور شعراء نے طرح طرح سے اس کو بیان کیا ہے لیکن سعدی کی سادگی ملاحظہ ہو:۔

ہمیں حکایتے روزے بدوستاں برسد

کہ سعدی از پئے جاناں برفت و جاں انداخت

لیلیٰ و مجنوں کی تلمیحات کے سلسلہ میں ناقہ و محمل کے متعلق شاعروں نے اچھے اچھے مضامین اختراع کئے

ہیں لیکن سعدی کا جذبۂ بیتاب دیکھئے :-

بدار اے ساربان محمل زمانے
کہ عہد وصل را آخر زمان ست

اسی نہج کا ایک اور شعر سن لیجئے :-

برق یمانی بجست ، باد بہاری بخاست
طاقت مجنوں برفت ، خیمۂ لیلیٰ کجاست

غزل کے شعر کی خوبی کا معیار یہ ہے کہ اس کا مطلب بیان نہ ہو سکے۔ سعدی کے ان شعروں کا مفہوم بیان کرنے کی کوشش کیجئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم کسی نازک آبگینہ کو ٹھیس پہونچا رہے ہیں۔ اس "سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت" کے دو چار شعر اور سن لیجئے :-

نہ من افتادہ تنہا بہ کمند آرزو یست | ہمہ کس سر تو دارد ، تو سر کدام داری

باشد کہ تو خود روزے از ما خبرے پرسی | ورنہ کہ برد ہیہات از ما بتو پیغامے

ہر کہ می بینم از بادِ غمت می گوید | سعدیا بر تو چہ رنج ست کہ بگداختۂ

آخر من و تو نہ دوست بودم | عہد تو شکست و من ہمانم

لازم ست احتمال چندیں درد | کہ محبت ہزار چندیں ست

گفتم چگونہ می کشی و زندہ می کن | از یک نگاہ کشت و جوابے دگر نداد

تخیل کی بلندی ، بیان کی ندرت ، انداز بیان کا اچھوتا پن ، ترکیبوں کی چستی ، مضمون آفرینی تو آپ کو بہت ملیگی ، لیکن "فدادگی" جو غزل کی جان ہے سعدی کے سوا کہیں نظر نہ آئے گی۔

تصحیح

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں صفحہ ۶۹ پر آخری سطر سے قبل کی سطر میں بجائے "بیار بستر ..... کے" بہار ، بستر بنا لیجئے۔ منیجر نگار۔

باب الاستفسار

عہدِ مغلیہ کا عسکری و مالی نظام

(جناب سید شوکت علی صاحب - آگرہ)

مغلوں کا فوجی نظام کیا تھا اور کن اقتصادی اُصول پر حکومت کا نظم و نسق قایم تھا، اگر زحمت نہ ہو تو مختصراً اس موضوع پر اظہارِ خیال فرمایئے۔

(نگار) مغلوں کی حکومت یکسر فوجی حکومت تھی اور سول و ملٹری کی جو تقسیم اس وقت نظر آتی ہے وہ ان کے دورِ سلطنت میں نہ تھی۔ گویا یوں سمجھئے کہ ایک قسم کا مارشل لا جاری تھا۔ حکومت کی آمدنی کا بڑا حصہ فوج ہی پر صرف ہوتا تھا اور جملہ نظم و نسق فوج ہی کے ہاتھ میں تھا۔ اس امر کا اندازہ کہ عسکری قوت کے لئے کتنا اہتمام کیا جاتا تھا سپاہ کی اس تعداد سے ہو سکتا ہے جس سے وہ حملہ و دفاع میں کام لیتے تھے۔

بابر نے جس وقت ہندوستان پر حملہ کر کے ابراہیم لودی کو پانی پت میں شکست دی ہے تو پوری ایک لاکھ کی جمعیت اس کے ساتھ تھی جس میں دس ہزار سوار اور باقی پیادہ فوج اور توپخانہ کے سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نہ ذرایع آمد و رفت وسیع تھے اور نہ خبر رسانی کے وسایل کثیر، اس لئے ظاہر ہے کہ اتنی بڑی فوج کی فراہمی، اسکی نقل و حرکت اور رسد رسانی میں کتنی زحمت اور کتنی دولت صرف ہوتی ہو گی۔

اکبر سے قبل چونکہ کوئی منظم حکومت مغلوں کی قایم نہ ہوئی تھی اس لئے ان سے یہ توقع بھی نہ ہو سکتی تھی کہ وہ کوئی مستقل باقاعدہ عسکری تنظیم کر سکتے تھے، لیکن جب اکبر تخت نشین ہوا اور مغلوں کے قدم مضبوطی سے ہندوستان میں جم گئے اس وقت البتہ عسکری تنظیم عمل میں آئی اور اس وسعت کے ساتھ کہ سارا ملک فوجی حکومت کے سپرد کر دیا گیا۔ اگر آپ اسوقت کے عہدہ داروں کے منصب پر غور کریں گے تو حیرت ہو گی کہ گورنر سے لیکر دربار کے مسخرے تک سب فوجی منصب رکھتے تھے۔

صوبہ کے گورنر کو سپہ سالار کہتے تھے اور پرگنہ کے حاکم کو فوجدار، علاوہ ان کے دوسرے درباریوں اور عہدہ داروں کی تعیین منصب بھی ان سواروں کی حیثیت سے ہوتی تھی جو ان کی ماتحتی میں کام کرتے تھے۔ چنانچہ شیخ ابوالفضل جو بادشاہ کا کاتب خصوصی تھا اور لڑنے بھڑنے کی خدمت اس کے سپرد نہ تھی، اپنے عہدہ کے لحاظ سے ۲۵۰۰ سواروں کا منصب دار تھا اور بیربر جو صرف مسخرہ شاعر کی حیثیت رکھتا تھا وہ بھی ایک ہزار سواروں کا افسر تھا۔ سید محمد میر عدل قاضی تھے لیکن ۹۰۰ سواروں کا اہتمام ان کے بھی سپرد تھا اور فیضی جس کا کام صرف شاعری) کرنا تھا ۴۰۰ سواروں کا کمانڈر تھا۔

سواروں کے کمانڈروں کو منصب دار کہا کرتے تھے لیکن ان میں بھی فرق مراتب پایا جاتا تھا۔ ۵۰۰ سے لیکر ۲۵۰۰ سواروں تک کے منصب داروں کو امیر کہتے تھے اور اس سے زیادہ کے منصب دار کو امیر کبیر۔

امراء کا علاوہ اس فوجی کے ایک منصب ذاتی بھی ہوا کرتا تھا، یعنی اگر کوئی پانچ ہزار سواروں کا منصب دار تھا تو اس کے معنے یہ تھے کہ رکھتا تھا وہ صرف ۴۰۰۰ سوار لیکن فوجی منصب کے لحاظ سے وہ پنجہزاری کہلاتا تھا۔ شاہجہاں نے تو یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ منصب داروں کو مقررہ تعداد کے ایک تہائی سے زیادہ سوار رکھنے کی ضرورت نہیں ہے اور بعض صورتوں میں صرف ایک چوتھائی کافی سمجھا گیا۔

اکبر کے زمانہ میں (شاہزادوں کو چھوڑکر) یہ فوجی منصب کم سے کم دس سوار اور زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار سواروں تک محدود تھا لیکن دو تین امیروں کو شش ہزاری و ہفت ہزاری منصب بھی عطا ہوا تھا۔

امراء کا مشاہرہ، منصب کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتا تھا یعنی ہفت ہزاری سے لیکر یک صدہ تک، تین لاکھ پچاس ہزار روپیہ تا چار ہزار روپیہ سالانہ (موجودہ سکہ کے حساب سے) ان امراء کا مشاہرہ جن کے تین درجے مقرر تھے اس طرح مقرر ہوتا تھا کہ پنجہزاری درجۂ اول کو دو لاکھ پچاس ہزار، درجۂ دوم کو ۲۴۲۵۰۰ اور درجۂ سوم کو ۲۳۵۰۰۰ روپیہ سالانہ۔

یہ مشاہرے ذاتی منصب سے متعلق ہوتے تھے تاکہ امراء اپنے اپنے صوبوں، نیز دربار میں اپنی حیثیت کو قائم رکھ سکیں اور اپنے ذاتی مصارف پورے کر سکیں۔ شاہی خدمت کے لئے سواروں کی جتنی تعداد وہ رکھتے تھے اس کا الاؤنس علٰحدہ ملتا تھا

سوار اپنے گھوڑوں کی نگہداشت اسلحہ کی فراہمی اور نقل و حرکت کے خود ذمہ دار ہوتے تھے۔ انکے بھی تین درجے تھے۔ تین گھوڑے والے، دو گھوڑے والے اور ایک گھوڑے والے۔ اول و دوم درجہ کا مشاہرہ پچیس روپیہ ماہوار

۱؎ وہ امراء جن کا ذاتی منصب فوجی منصب کے برابر ہوتا تھا درجۂ اول کے امراء کہلاتے تھے۔ وہ جن کا فوجی منصب ذاتی منصب کا نصف ہوتا تھا درجۂ دوم میں شمار ہوتے تھے اور وہ جن کا فوجی منصب بہ نسبت ذاتی منصب کے نصف سے بھی کم ہوتا تھا۔ درجۂ سوم کے امیر کہلاتے تھے

اور درجۂ سوم کا ساڑھے سولہ روپیہ ماہوار۔ بعد میں دکن کے سواروں کا مشاہرہ کچھ بڑھا دیا گیا تھا۔

وہ سوار جو خود اپنے گھوڑے نہیں رکھ سکتے تھے انھیں بارگیر کہتے تھے اور ان سواروں کے خادم سمجھے جاتے تھے جو انھیں گھوڑے فراہم کرتے تھے۔

اول اول امرا یا منصب داروں کا مشاہرہ نقد مقرر نہ تھا بلکہ جاگیروں کی صورت میں ہوا کرتا تھا لیکن ۱۵۷۴ء میں شہنشاہ اکبر نے تمام جاگیریں خالصہ میں شامل کر کے، تمام منصب داروں کا مشاہرہ نقد مقرر کر دیا۔ اس سے امراء میں بہت برہمی پیدا ہوگئی اور بنگال، گجرات اور سندھ کے امرار کی جاگیریں پھر بحال کر دی گئیں، قرب و جوار کے صوبوں میں البتہ وہی نقد کا دستور قایم ہو گیا

اکبر نے ایک اصلاح اور کی وہ یہ کہ منصب دار اپنے گھوڑوں کو داغ کرائیں تاکہ پتہ چل سکے کہ وہ مقررہ تعداد گھوڑوں کی رکھتے بھی ہیں یا نہیں۔ یہ طریقہ اول اول ایران و ماوراء النہر کے عہد سلجوقی میں رائج ہوا تھا جسے ۱۳۱۲ء میں علاء الدین خلجی نے بھی جاری کیا تھا، لیکن بعد کو اس کی پابندی قائم نہ رہی اور پھر دو صدی بعد ۱۵۴۱ء میں شیرشاہ نے دوبارہ قایم کیا۔ شیرشاہ کے مرنے پر یہ رواج موقوف ہو گیا تھا لیکن اکبر نے پھر اسے جاری کیا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ منصب دار واقعی اتنے سوار رکھنے پر مجبور کئے جائیں جتنے از روئے منصب و مشاہرہ ان کو رکھنے چاہیئے۔ اس کی بھی سخت مخالفت ہوئی اور آخرکار پنجہزاری امرار کو اس قاعدہ سے مستثنیٰ کرنا پڑا، اور عہد مغلیہ کے آخر میں سبھی مستثنیٰ ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوار کی حقیقی تعداد کچھ ہوتی تھی اور کاغذات میں کچھ اندراج ہوتا تھا، چنانچہ سنہ ۱۶۸۶ء میں بنگال کا ایک امیر ۷۰۰ سواروں کا منصب رکھتا تھا لیکن ان کی تعداد ستر، اسّی سے زیادہ نہ تھی۔

شہزادوں اور منصب داروں کی فوج کے علاوہ خود بادشاہ کی بھی ذاتی فوج ہوا کرتی تھی جسے والاشاہی کہتے تھے۔ اس فوج میں زیادہ تر وہی لوگ ہوتے تھے جو کمسنی ہی سے (بہ حالت شہزادگی) فرمانروا کی ذات سے وابستہ ہوتے تھے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں اس باڈی گارڈ کی تعداد چار ہزار تھی، ان کے مشاہرہ کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں نہیں ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ منصب داروں کے سواروں سے انھیں زیادہ تنخواہ ملتی تھی۔

اکبر نے ایک فوج احدیوں کی بھی قایم کی تھی۔ اور احدی کہنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ انفرادی طور پر ذات شاہانہ سے وابستہ ہوتے تھے۔ اسوقت اُردو زبان میں احدی کا لفظ کاہل انسان کے لئے استعمال ہوتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً ان احدیوں کو دوسرے سواروں کے مقابلہ میں زیادہ آرام ملتا تھا اور وہ رفتہ رفتہ کاہل ہو جاتے تھے۔ احدیوں کا درجہ منصب داروں سے کم اور عام سواروں سے زیادہ سمجھا جاتا تھا۔

سواروں کے علاوہ پیادہ فوج بھی رکھی جاتی تھی جس میں دربان، چوکیدار، ہرکارے، پالکی بردار سبھی شامل تھے۔ لیکن وہ سپاہی جو جنگ کے لئے مخصوص تھے انھیں برق انداز، تیرانداز اور نیزہ بردار کہتے تھے۔

اکبر کے زمانہ میں برق انداز (بندوق چلانے والے) بارہ ہزار کی تعداد میں تھے جن کے ہر دستہ کے افسر کو "داروغہ" کہتے تھے۔ ان کی تنخواہوں کا حساب وکتاب بالکل علحدہ رہتا تھا۔ ادنیٰ حیثیت کے افسران چار درجے رکھتے تھے، درجۂ اول والے کو ساڑھے سات روپیہ، دوسرے درجہ والے کو سات روپیہ، تیسرے درجہ کے افسر کو پونے سات اور چوتھے درجہ والے کو ساڑھے چھ روپیہ ماہوار ملتے تھے۔

اسوقت ایک فوج اور بھی تھی جسے "داخلی" کہتے تھے۔ اس میں ایک چوتھائی برق انداز ہوتے تھے اور تین چوتھائی تیر انداز۔ یہ وہ فوج تھی جو پرگنہ کے فوجداروں کے پاس رہتی تھی تاکہ قیام امن وسکون ووصولیِ مالیہ میں وقت ضرورت اس سے کام لیا جائے۔ تیر انداز بہ نسبت برق اندازوں کے زیادہ خیال کئے جاتے تھے۔ کیونکہ برق انداز جب تک اپنی بندوق بھرے یہ متعدد تیر سر کرسکتا تھا۔ جنگ کے وقت سواروں کا مقابلہ پیادہ فوج سے نہیں بلکہ سواروں ہی سے کیا جاتا تھا اور یہ حقیقت بہت بعد کو معلوم ہوئی کہ اصل اہمیت پیادہ فوج ہی کو حاصل ہے۔ توپ خانہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک وزنی دوسرا ہلکا۔ بابر کے زمانہ میں توپخانہ بہت اچھا تھا اور اس میں کام کرنے والے زیادہ تر، ترک اور نومسلم پرتگالی ہوا کرتے تھے۔ ہلکی توپیں بیل گاڑیوں پر لادی جاتی تھیں اور ان سے بھی زیادہ ہلکی (جنھیں زمبورک کہتے تھے) اونٹوں پر ہوتی تھیں۔ بھاری توپوں کو لیجانے کے لئے کئی کئی بیل جوتے جاتے تھے اور کبھی کبھی یہ کام ہاتھیوں سے بھی لیا جاتا تھا۔ پھر جوں جوں عسکری انتظام خراب ہوتا گیا، بھاری توپوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ بسا اوقات ان کا لیجانا مشکل ہوتا تھا۔ گولے، ٹھوس لوہے اور پتھر کے ہوا کرتے تھے، بعض اوقات ان میں تانبے کے پیسے بھر کر داغتے تھے۔ توپخانہ کا افسر اعلیٰ میر آتش کے نام سے موسوم ہوتا تھا۔ سو برق اندازوں کے افسر کو صدی وال کہتے تھے اور دس برق اندازوں کے افسر کو میر دہا۔ اکبر جنگ کے وقت ہاتھیوں سے بہت کام لیتا تھا۔ اور انھیں پر سوار ہوکر تیر انداز اور برق انداز جنگ کرتے تھے، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ بسا اوقات ہاتھی خود اپنی ہی فوج کو زیادہ نقصان پہونچا دیتے ہیں اس لئے ان کا استعمال ترک کر دیا گیا اور ان سے صرف سواری کا کام لیا جانے لگا۔

اکبر کا دستور تھا کہ جب وہ ہاتھی پر بیٹھکر جنگ کرتا تو اس کے چاروں طرف دس، بیس بلکہ تیس ہاتھی اور ہوتے تھے۔ شاہی ہاتھی خاصہ کہلاتا تھا اور دوسرے ہاتھی حلقہ۔ اکبر کے بعد بھی یہ تفریق بدستور قایم رہی لیکن مفہوم کے لحاظ سے اتنا فرق ہوگیا کہ سواری کے تمام ہاتھی خاصہ کہلائے جانے لگے اور باربرداری کے ہاتھی حلقہ۔

ہفت ہزاری منصب داروں سے لیکر پانصدی منصب داروں تک کے لئے قاعدہ مقرر تھا کہ وہ ایک ہاتھی سواری کے لئے اور پانچ ہاتھی باربرداری کے لئے ہر ڈھائی ہزار کے منصب کے حساب سے ضرور اپنے پاس رکھیں۔ یہ ہاتھی بادشاہ کی ملکیت ہوا کرتے تھے اور سوائے جنگ کے منصبداروں کے استعمال میں کبھی نہ آتے تھے۔

فوج کا سپہ سالار خود بادشاہ ہوا کرتا تھا لیکن عام انتظام "بخشی الممالک" کے سپرد ہوتا تھا، اس کی ماتحتی میں علاوہ متعدد کلرکوں کے (جنھیں تیکچی کہتے تھے) تین بخشی بھی ہوا کرتے تھے۔ فوجی بھرتی، سپاہیوں کی گنتی، منصب داروں اور سواروں کی تنخواہ وغیرہ کا حساب سب اسی محکمہ کے سپرد تھا۔ سال میں دو مرتبہ فوجوں کا معاینہ ہوا کرتا تھا اور میر بخشی دیکھتا تھا کہ منصب داری کے گھوڑے داغی اور قابل استعمال ہیں یا نہیں۔ جو گھوڑے بیکار سمجھے جاتے تھے ان کو علحدہ کر کے دوسرے گھوڑے رکھنے کا حکم دیا جاتا تھا۔

والاشاہی یا شاہی باڈی گارڈ کا انتظام سوائے ایک میر بخشی کے کسی اور کے سپرد نہیں کیا گیا۔

اسی طرح احدیوں کا میر بخشی علحدہ ہوا کرتا تھا جس کا انتخاب اونچے درجہ کے امرا سے کیا جاتا تھا۔ جب میر بخشی کسی کو احدیوں میں بھرتی کرتا تھا تو واقعہ نگار اس کا نام درج کر کے ایک سند اس کو دیتا تھا جو وزیر کے سامنے پیش کیجاتی تھی۔ صوبہ داریوں میں بھی فوج کا انتظام وہاں کے میر بخشیوں کے سپرد تھا۔

اکبر کے زمانہ میں کل تعداد افواج کیا تھی۔ اس کا اندازہ مشکل ہے کیونکہ امرا کے فوجی منصب کی تعیین کہیں سے ظاہر نہیں ہوتی۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر کے زمانہ میں بارہ ہزار برق انداز تھے اور اگر بلاک مین کے بیان کو صحیح سمجھا جائے تو کل سپاہ ۲۵ ہزار ثابت ہوتی ہے، لیکن یہ بیان درست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جب ہمایوں ایک لاکھ سوار میدان جنگ میں لے آتا تھا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اکبر نے اس میں اضافہ نہ کیا ہو اور توسیع سلطنت کے لئے زیادہ فوج کی ضرورت نہ ہوئی ہو۔ بلاک مین نے یہ تعداد غالباً صرف شاہی باڈی گارڈ کی ظاہر کی ہے۔ شاہجہاں کے آخری نصف دور میں مناصب کے لحاظ سے ۲۵۵۰۰۰ کی جمیعت ہونی چاہئے تھی، لیکن کسی منصب دار نے کبھی مقررہ تعداد فوج کی نہیں رکھی اور اس لئے حسب اندراج "بادشاہ نامہ" اعداد و شمار یہ تھے:۔ منصب دار ۸۰۰۰ — احدی اور سوار برق انداز ۲۰۰۰۰۰ — (فوجداروں کے پاس جو سپاہ وصول مالیانہ وغیرہ کے لئے رہتی تھی اس سے علحدہ تھی) — پیادہ برق انداز، تیر انداز ۴۰۰۰۰ — (ان میں سے دس ہزار سپاہی ہیڈ کوارٹر میں رہتے تھے اور دس ہزار قلعوں اور صوبوں میں)

اورنگ زیب کے زمانہ میں پچاس ہزار سوار رکاب میں رہتے تھے اور تقریباً اتنے ہی ادھر ادھر نقل و حرکت کرتے رہتے تھے۔ سواروں کے علاوہ بیس ہزار پیادہ فوج خالص راجپوتوں کی تھی۔ ان میں بارہ ہزار توپخانے کے لئے وقف تھے اور باقی شاہی حفاظت کے لئے — عہد مغلیہ میں فوج کی باقاعدہ قواعد کا رواج نہ تھا اور نہ صف بندی کے خاص اصول مقرر تھے، بخشی کے معاینہ کے وقت ایک کے پیچھے ایک سامنے سے گزر جاتے تھے جب بادشاہ شکار کے لئے جاتا تھا تو البتہ فوج بھی ہانکے میں شریک ہوتی تھی اور یہی ان کی بڑی قواعد تھی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ہر سپاہی مگدر اور لیزم ہلا کر ورزش کرتا رہتا تھا اور فنون سپہ گری کی مشق بھی جاری رکھتا تھا۔

مغل حکومت کا انحصار صرف کاشت پر تھا۔ معدنیات میں لوہا اور تانبا ضرور میسر آجاتا تھا لیکن کافی مصارف
کے بعد، کوئلہ کا وجود بالکل نہ تھا۔ چونا، نمک اور شورہ بیشک پایا جاتا تھا اور عمارتی پتھر بھی۔
قابل کاشت رقبہ کو دیہہ (گاؤں) کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اور متعدد گاؤں کا رقبہ پرگنہ یا محال کہلاتا تھا
اکثر گاؤں کاشتکاروں کے قبضہ میں تھے جو مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور ہر خاندان جداگانہ رقبہ میں کاشت
کرتا تھا۔ کاشتکاروں کے ان تمام مختلف خاندانوں کا تعلق مقدم سے ہوا کرتا تھا جو مالگذاری دینے کا ذمہ دار ہوتا
تھا اور گاؤں کا تمام انتظام کرتا تھا ــــ کاشت زیادہ تر غلہ کی ہوتی تھی، ترکاری اور نیشکر بھی بوتے تھے لیکن کم،
روغنی تخم کی کاشت بھی صرف ضرورت کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ افیون زیادہ بوئی جاتی تھی اور تماکو کا رواج بھی بہت
وسیع ہوگیا تھا۔ روئی، سن، اور نیل خاص صنعتی پیداواریں تھیں۔ ہر کاشتکار کے پاس بہت مختصر سا رقبہ ہوا کرتا
تھا جسے وہ خود اپنی محنت اور اپنے خاندان کی مدد سے کاشت کرتا تھا۔ کھیت جوتنے کا کام بیلوں سے لیا جاتا تھا
اور چونکہ کوئی مرکزی سرمایہ کاشتکاری کا نہ تھا اس لئے ہر کاشتکار مجبور ہوتا تھا کہ وہ ہر فصل پر جلد سے جلد اپنی پیداوار
کو فروخت کردے ــــ صنعتیں مختلف و متعدد تھیں جن میں پارچہ بافی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ سوتی کپڑے
عام طور پر ہر جگہ طیار کئے جاتے تھے اور زیادہ تر ملک ہی کے اندر استعمال ہوتے تھے، ساحلی مقامات سے البتہ
کپڑا باہر بھی جاتا تھا، لیکن ململ اور چھپے ہوئے کپڑے زیادہ تر خشکی کے راستہ سے باہر جاتے تھے۔
جن بازاروں میں اس کپڑے کی مانگ تھی وہ بہت قدامت پرست تھے اور سوائے خاص نمونوں کے
کوئی اور کپڑا استعمال نہ کرتے تھے اس لئے ایجاد و اختراع کا کوئی موقعہ نہ تھا۔
ریشمی کپڑا زیادہ تر بنگال و گجرات میں طیار ہوتا تھا اور صرف مقامی ضروریات کے لحاظ سے، جوٹ اور سن
بھی صرف مقامی اہمیت رکھتے تھے لیکن سترھویں صدی میں سن کے بورے وغیرہ باہر جانے لگے تھے۔
ملک کے ان حصوں میں جہاں امن و امان رہتا تھا تجارت خاصی ترقی پر تھی اور ایک منظم صورت رکھتی
تھی۔ ہنڈیوں کے ذریعہ سے لین دین جاری تھا نہ صرف ملک کے اندر بلکہ بعض بیرونی ممالک میں بھی۔
باہر سے جو سوداگر آتے تھے وہ مال کی زیادہ مقدار لیجانا پسند نہ کرتے تھے بلکہ اپنے روپیہ کو دس بارہ فیصدی
سود پر تقسیم کردیتے تھے۔ بیرون ملک لے خشکی کے دو راستے براہ کابل و قندھار مقرر تھے، تبت کا راستہ بھی کھلا
ہوا تھا لیکن اس سے بہت کم فایدہ اُٹھایا جاتا تھا ــــ بحری راستہ کے ذریعہ سے گجرات کا تعلق بحر احمر، خلیج
فارس، مشرقی افریقہ، سماترا اور ملاکا وغیرہ سے بھی تھا۔ سندھ کا تجارتی تعلق ایران سے تھا لیکن زیادہ
وسیع پیمانہ پر نہیں۔ بنگال کا کاروباری تعلق زیادہ جنوبی ہند، برما اور سیام سے تھا۔
سولھویں صدی میں تمام بحری راستوں پر پرتگالیوں کا اقتدار قایم تھا جو زیادہ تر ساحل کا رومنڈل

سے (جہاں مغلوں کا قبضہ نہ تھا) برازیل اور مغربی افریقہ کے لئے کپڑا لیجاتے تھے۔ جب ۱۶۱۱ء میں انگریزوں نے اور ۱۶۱۶ء میں ڈچ نے اپنی فیکٹریاں سورت میں قایم کیں تو چھینٹ اور نیل مغربی یورپ کو زیادہ مقدار میں جانے لگا۔ سترھویں صدی کے وسط میں نیل کی تجارت گر گئی کیونکہ ہندوستان ویسٹ انڈیز کا مقابلہ نہ کر سکا اور اُدھر ۱۶۳۰ء کے قحط کی وجہ سے گجرات کی آبادی کم ہو گئی جس سے چھینٹ کی تجارت مشرقی ساحل کی طرف زیادہ وسیع ہو گئی۔ اسی صدی میں جب انگریزوں اور ڈچ نے اپنی فیکٹریاں ہوگلی پر قایم کیں تو ریشم، شورہ، ململ اور نفیس چھینٹ کی تجارت یہاں زیادہ بڑھ گئی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں مغربی ذوق لباس کے متعلق بہت بدل گیا اور ململ اور چھینٹ کی مانگ بہت بڑھ گئی جسے بنگال اور مدراس سے پورا کیا جاتا تھا۔ غایر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے تجارتی تعلقات کا مخصوص نقطۂ نظر سونے چاندی کی درآمد تھی۔ ہندوستان والے خود زیادہ چیزیں باہر کی نہ خریدتے تھے بلکہ زیادہ تر اس کے خواہشمند رہتے تھے کہ وہ اپنی چیزیں فروخت کر کے نقد حاصل کر لیں۔ پھر چونکہ مغربی یورپ ہندوستان کی اس خواہش کو پورا نہ کر سکتا تھا، اس لئے تجارتی کمپنیاں اس کوشش میں رہتی تھیں کہ دوسرے ملکوں سے چاندی سونا کھینچ کھینچ کر ہندوستان لاتے رہیں، چنانچہ چین سے چاندی اور جاپان سے سونا فراہم کر کے یہاں لایا جاتا تھا۔ اندرون ملک کے ذرایع نقل و حرکت بہت ناکافی و نامکمل تھے۔ ہر چند اٹک، گنگا، جمنا اور بنگال کے دریاؤں کے ذریعہ سے مال بہ کثرت اِدھر اُدھر جاتا تھا، لیکن اتنے وسیع ملک کے لئے یہ محدود وسایل کہاں تک کام دے سکتے تھے۔ مجبوراً خشکی کے راستے اختیار کرنے پڑتے تھے جو ناہموار اور غیر محفوظ اور تکلیف دہ تھے۔ سڑکیں بہت کم تھیں اور تھیں بھی تو بالکل خام۔ اکثر تو صرف پگڈنڈی کی صورت میں تھیں اور سوائے اس علامت کے کہ اس کے دو رویہ درختوں کی قطار ہوتی تھی، کوئی اور نشان اسکے گزرگاہ ہونے کا نہ پایا جاتا تھا۔ راستے میں جابجا کاروانسرائے بنی ہوئی تھیں اور تجارتی قافلے یہیں قیام کرتے تھے۔ باربرداروں کے لئے زیادہ تر گاڑیاں، بیل اور اونٹ سے کام لیا جاتا تھا۔ آدمی گھوڑوں، پالکیوں یا پھر بیلوں کی گاڑی پر سفر کیا کرتے تھے۔ ڈاک کا انتظام اچھا تھا لیکن صرف سرکاری مراسلت کے لئے عام لوگوں کو خود اپنے ذاتی ہرکارے رکھنا پڑتے تھے ــــ معاشرت کا معیار عام طور پر بہت ادنیٰ تھا اور سوائے ان امراء کے جو ضرورت سے زیادہ پاتے تھے اور اسی طرح اسے خرچ کرتے تھے تمام آبادی افلاس و تنگدستی میں مبتلا تھی ــــ سلطنت کی خوشحالی کا انحصار تین چیزوں پر تھا۔ ایک بارش کا وقت پر ہونا، دوسرے امن و سکون کا قایم رہنا اور تیسرے انتظام مالگذاری۔ پھر چونکہ بارش کی طرف سے اکثر شکایت رہتی تھی اور

لہ انگریزی میں اسے CALICO کہتے ہیں کیونکہ یہ کپڑا زیادہ تر کلکتہ میں طیار ہوتا تھا۔

ذرائع نقل و حرکت عام نہ ہونے کی وجہ سے قحط زدہ مقامات کو دوسری جگہ سے غلہ فراہم نہ ہو سکتا تھا اس لئے لوگ اِدھر اُدھر چلے جایا کرتے تھے اور کوئی مستقل آبادی نہ ہونے پاتی تھی۔ اگر بارش اچھی ہو جاتی تھی اور پیداوار کافی ہوتی تھی تو بھی خوشحالی کا کوئی امکان نہ تھا کیونکہ مرکزی منڈیاں موجود نہ تھیں جہاں زیادہ پیداوار کی کھپت ہو سکے، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کاشتکار مفلس اور نادار رہتے تھے — ملکی و مالی نظام کی صورت یہ تھی کہ بادشاہ ان دونوں کا مالک و مختار سمجھا جاتا تھا اور اس کے چار مددگار ہوا کرتے تھے۔ ایک وکیل (وزیر اعظم) دوسرا وزیر (حاکم مال)، تیسرا بخشی اور چوتھا صدر۔ وکیل کی جگہ ہمیشہ پُر نہ رہتی تھی اور اس کی خدمات بھی وزیر کے سپرد ہوتی تھیں، بخشی کا حال آپ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں۔ صدر کا کام شریعت کا نفاذ تھا۔

جس وقت مغلوں کی حکومت شمالی ہند میں قایم ہوئی تو یہاں کا نظام اچھا نہ تھا، ملک کے مختلف حصے مختلف سرداروں کے ہاتھ میں تھے اور وہی سیاہ و سفید کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ اکبر نے سلطنت کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا جہاں کا ذمہ دار حاکم سپہ سالار یا صوبہ دار کہلاتا تھا۔ لیکن ۱۵۹۵ء کے بعد وصولی مالگذاری کا کام اس سے علحدہ کر لیا گیا۔ علاوہ ان صوبہ داروں کے خاص خاص مقامات پر فوجدار بھی مقرر کئے گئے جو قلعہ بند مقامات میں قلعہ دار کی حیثیت بھی رکھتے تھے — شہر کا افسر کوتوال کہلاتا تھا جو پولیس، عدالت، میونسپلٹی اور محکمۂ احتساب کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ پولیس اس وقت نہ پائی جاتی تھی بلکہ اس کا کام فوج سے لیا جاتا تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ سلطنت کے ہر حصہ میں (خاصکر ان مقامات میں جہاں کی فوجداری ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی) یہی نظام قایم تھا تاہم قیام امن ہر افسر کا فرض تھا اور سپہ سالار و فوجدار اس کے ذمہ دار قرار دئے جاتے تھے۔

مالی انتظام یا دیوانی وزیر کے سپرد تھی اور وہ ذمہ دار تھا کہ دربار یا "حضور" سے جو احکام صادر ہوں اُن کی تعمیل کرے۔ ہر چند کچھ آمدنی کروڑگیری، نمک، ٹکسال، نذرانہ وغیرہ سے بھی ہوتی تھی لیکن بڑا ذریعہ آمدنی کا لگان ہی تھا — مسلمانوں کی آمد سے قبل ہر کاشتکار اپنی پیداوار کا خاص حصہ جسے فرمانروا مقرر کر دیتا تھا لگان کی صورت سے حکومت کو دیدیا کرتا تھا۔ مسلمانوں نے اس قاعدہ کو بدستور جاری رکھا اور زمین کی ملکیت بدستور کاشتکاروں کی قایم رہی — مغلوں کے زمانہ میں زمین کی دو قسمیں ہو گئیں۔ خالصہ یا دیوانی اور جاگیر۔ خاص خاص امراء کی جاگیریں خراج سے مستثنیٰ تھیں لیکن ایک خاص رقم خزانۂ شاہی میں جمع کرنا ان کا فرض تھا، چھوٹے چھوٹے امراء کی جاگیروں کی مالگزاری متعین تھی، جن میں سے ایک حصہ وہ اپنے لئے مخصوص رکھتے تھے اور باقی حکومت کے خزانہ میں داخل کر دیتے تھے — ملک کے وہ حصے جو براہ راست حکومت کے زیر انتظام تھے انھیں خالصہ کہتے تھے یہ حصے خزانۂ شاہی میں نقد داخل کرنے کے لئے مخصوص تھے اور وزیر کا عملہ اس کا انتظام کرتا تھا۔ اول اول یہ خدمت صوبہ دار کے سپرد تھی لیکن ۱۵۹۶ء میں ہر صوبہ میں ایک دیوان مقرر کیا گیا جو براہ راست وزارت سے واسطہ رکھتا تھا اور

اسی وقت سے دیوانی اور فوجداری علحدہ علحدہ ہوگئی ـــ وہ حصے جو خزانۂ شاہی سے وابستہ نہ تھے، جاگیروں میں منقسم تھے یعنی ہر وہ افسر جس کا کوئی مشاہرہ متعین تھا اسے اتنی ہی آمدنی کی جاگیر عطا کردیجاتی تھی۔ ملک کا اکثر حصہ انھیں جاگیروں میں تقسیم تھا اور خالصہ یا دیوانی کے لئے ملک کا صرف چھٹا یا ساتواں حصہ رہجاتا تھا ـــ اکبر نے کاشتکار کی پیداوار کا تہائی حصہ بطور لگان کے مقرر کیا تھا لیکن سترھویں صدی میں یہ نصف حصہ تک پہونچ گیا تھا۔ اس کی تعیین کے تین طریقے تھے :۔ (غلہ بخشی ۔ پیمایشی ۔ نسق) غلہ بخشی کی صورت میں فصل یا خرمن دیکھکر ایک نظری تخمینہ پیداوار کا کرلیا جاتا تھا اور اس کے تہائی کی قیمت، اگا کر نقد وصول کرلیا جاتا تھا۔ پیمایشی کی صورت میں ایک مقرر رقم رقبۂ کاشت کے لحاظ سے متعین ہوتی تھی۔ ان دونوں صورتوں میں لگان عام طور پر نقد ہی وصول کیا جاتا تھا، لیکن ملک کے ان حصوں میں جہاں کرنسی کا رواج زیادہ نہ تھا غلہ کی صورت میں بھی لے لیا جاتا تھا۔ نسق کی صورت یہ ہوتی تھی کہ پورے گاؤں کی جمعبندی قایم کرکے مقدم یا مکھیا سے وصول کرلیجاتی تھی ـــ یہ امر کہ ان تینوں طریقوں میں کونسا طریقہ وصولی لگان کا کس جگہ عمل میں لایا جائے صرف بادشاہ کی مرضی پر منحصر تھا۔ جس وقت بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا ہے، نسق کا طریقہ رائج تھا اور بابر نے بھی اسی کو قایم رکھا۔ شیر شاہ نے پیمایشی طریقہ رائج کیا اور اول اول اکبر نے بھی اسی کو پسند کیا۔ ہر رقبہ کی مالگزاری اسکی پیداوار کا اندازہ کرکے ایک تہائی مقرر کردیجاتی تھی اور کہیں نقد وصول کیجاتی تھی اور کہیں غلہ کی صورت میں، بعد کو اسکی دقتیں محسوس کرکے نقد مالگزاری (۴۰ دام فی روپیہ کے حساب سے) مقرر کردی گئی ـــ مختلف زمینوں کی مختلف پیداوار کے لحاظ سے نرخ بھی چیزوں کا مقرر کیا گیا اور اکبر کے دورِ حکومت میں اسی کی پابندی رہی، لیکن جہانگیر کے زمانہ میں اس کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا اور نسق کی صورت اختیار کی گئی (جو اب تک جاری ہے) البتہ وہ رقبے جو زیادہ اُجاڑ تھے اور جہاں کے مقدم وصولی کی ذمہ داری نہ لے سکتے تھے وہاں غلہ بخشی یا پیمایشی طریقہ سے وصولی ہوتی تھی ـــ شہروں میں عدالت و انصاف کا کام قاضی کے سپرد ہوتا تھا اور مفصلات میں یہ خدمت عمال کے سپرد تھی۔ جھگڑوں کی تحقیقات سرسری اور سزا سخت ہوتی تھی لیکن اسلامی شریعت کے مطابق کبھی سزائیں نہیں دی گئیں ـــ مقامی افسران، مقامی انتظام کے لئے ٹیکس کے ذریعہ سے بھی رقمیں وصول کیا کرتے تھے، اندرونی و بیرونی تجارت پر بھی زبردست ڈیوٹی لگائی جاتی تھی، اور ہر چند اکبر اور اورنگ زیب، دونوں نے اسکی سخت ممانعت کردی تھی لیکن یہ دستور کسی نہ کسی صورت سے علیٰ حالہٖ قایم رہا ـــ

ٹکسال پر خاص توجہ کی جاتی تھی کیونکہ اسکی آمدنی بادشاہ کو ملتی تھی ۔ سکے، سونے، چاندی اور تانبے کے ڈھالے جاتے تھے لیکن چونکہ ان کی قیمت دھات ہونے کے لحاظ سے متعین ہوتی تھی اس لئے مبادلہ کا نرخ گھٹتا بڑھتا رہتا تھا۔ خاص سکۂ رائج الوقت چاندی کا روپیہ تھا جس میں ۱۸۰ گرین خالص چاندی ہوتی تھی۔ تانبہ کا سکہ دام کہلاتا تھا جس کا وزن ۳۲۴ گرین کا ہوتا تھا۔ انکے علاوہ اور بھی متعدد چھوٹے چھوٹے سکے رائج تھے ـــ اوزان میں من کا رواج تھا جو ملک کے مختلف حصوں میں مختلف حیثیت رکھتا تھا۔ جنوبی ہند میں وہ ۲۵ پونڈ وزن کا ہوتا تھا اور گجرات میں ۳۳ پونڈ کا (جو بعد کو ۱۶۳۵ء میں ۴۰ پونڈ کا کردیا گیا) شمالی ہند میں اکبر کی تخت نشینی کے وقت اس کا وزن ۲۸ پونڈ کا تھا لیکن اکبر نے اسے ۵۵ پونڈ کا کردیا، جہانگیر نے ۶۶ پونڈ اور شاہجہاں نے ۷۴ پونڈ۔ مغربی بنگال میں اس کا وزن ۴۲ پونڈ تھا اور مشرقی بنگال میں ۴۶ پونڈ۔ ناپ میں گز کا رواج تھا جو اکبر کے زمانہ میں ۳۲ انچ کا تھا اور بعد کو ۴۰ انچ کردیا گیا۔ جنوب میں ذراع یا ہاتھ کی پیمائش رائج تھی جس کی لمبائی ۱۸ انچ ہوتی تھی، لیکن گجرات میں ذراع ۲۶ انچ کا تھا اور بنگال میں ۲۷ انچ کا۔

محیّرات

بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

آپ کو معلوم ہے کہ امریکہ کی فراوانی دولت کا کیا عالم ہے؟ وہاں ۵۹۴ انسان ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک کی سالانہ آمدنی ایک ملین ڈالر سے کم نہیں (یعنی تقریباً ۴۰ لاکھ روپیہ)، ۲۳۱ نفوس وہ ہیں جن میں سے ہر ایک ۱½ ملین ڈالر سالانہ کماتا ہے، ۱۲۲ وہ ہیں جن کی آمدنی ۲ ملین ڈالر سالانہ ہے، ۶۶ انسان ایسے ہیں جن کی آمدنی تقریباً ۳ ملین ڈالر سالانہ ہے، ۳۲ وہ ہیں جن کی آمدنی چار اور پانچ ملین کے درمیان ہے اور ۳۶ ایسے ہیں جن کی آمدنی ۵ ملین سے زیادہ یعنی تقریباً پونے دو کروڑ روپیہ سالانہ۔

سنہ ۳۲ء میں ٹیکس سے جو آمدنی امریکہ کو ہوئی اس کی مجموعی مقدار ۱۴۱۵۵۳ ملین ڈالر تھی۔ لیکن باوجود اس فراوانی دولت کے، باوجود اس انبار زر و سیم کے وہاں ایک کرور سے زیادہ انسان ایسے بھی بستے ہیں جن کو ایک ٹکڑا روٹی کا بھی اطمینان سے کھانے کو نصیب نہیں ہوتا؟

یہ ہے تقسیم زر و سیم کا وہ عدم توازن جس نے دنیا کے امن و سکون کو متزلزل کر رکھا ہے اور جو اشتراکیت کے خونخوار دیوتا کو شانہ ہلا ہلا کر جگا رہا ہے۔

آفتاب شیشے میں

آپ نے آنکھ کے ڈاکٹروں کو اکثر یہ کہتے سنا ہوگا کہ رات کو لکھنا پڑھنا بصارت کے لئے نقصان رساں ہے لیکن اُن سے سوال کیجئے کہ کیوں، تو وہ اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکیں گے۔

چکاگو کے ایک ڈاکٹر نے حال ہی میں اس کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ مصنوعی روشنی چونکہ فوق البنفسجی (ULTRA VIOLET) شعاعوں سے خالی ہوتی ہے، اس لئے وہ بینائی کو خراب کرتی ہے۔

اور ضرورت ہے کہ کوئی ایسی روشنی پیدا کی جائے جو اس نقص سے خالی ہو۔ اسی سلسلہ میں اس نے چکاگو کے کسی ماہر برقیات کی ایک جدید ترین اختراع کی طرف بھی توجہ دلائی ہے جس کے ذریعہ سے آفتاب کی روشنی کو شیشوں میں محفوظ کر لیا جاتا ہے اور جس سے رات دن ہر وقت کام لیا جا سکتا ہے۔

جس وقت اس سربند شیشہ پر ایک خاص قسم کی کہربائی شعاع ڈالی جاتی ہے تو اس کے اندر سے

بالکل وہی روشنی پیدا ہوتی ہے جو آفتاب کی ہے، پھر چونکہ جسم انسانی کو بقائے صحت و نشاط کے لئے نور آفتاب کی سخت ضرورت ہے اس لئے امید کیجاتی ہے کہ یہ ایجاد ڈاکٹری کی دنیا میں بہت مفید ثابت ہوگی کیونکہ اسکے ذریعہ سے ہر موسم میں ہر وقت اور ہر جگہ آفتاب کی صحت بخش روشنی حاصل ہوسکے گی اور بہت سے ایسے مریض جو نور آفتاب سے پورا فایدہ نہیں اُٹھا سکتے اس سے مستفید ہوسکیں گے۔

مکھیوں کی پرورشگاہ

امریکہ کا ایک صوبہ ہے جس کا نام جارجیا ہے۔ اس کے ایک قصبہ کے جوار میں جسے ہین کہتے ہیں تین سو ایکڑ کا مزرعہ ہے جو ایک شخص موسلی نامے کے قبضہ میں ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ دنیا کا عجیب و غریب مزرعہ ہے۔

اس کا مالک پیداوار کاشت حاصل کرنے کے بجائے مکھیوں کی پرورش کے لئے وقف کردیتا ہے جہاں بالکل جدید علمی طریقوں سے ان کی پیدائش و نشو و نما کا انتظام کیا جاتا ہے۔ یعنی ساری دنیا تو اس فکر میں ہے کہ مکھیاں کسی طرح فنا کی جائیں اور یہ شخص ان کی افزائش و نشو و نما میں مصروف رہتا ہے۔

اس کا مقصود اس سے صرف تجارتی فایدہ ہے کیونکہ مچھلی کی محبوب ترین غذا مکھی ہے اور یہ مچھلی کے شکاریوں کے ہاتھ انھیں فروخت کرتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص صرف مکھیوں کی تجارت سے بڑا دولتمند ہوگیا ہے۔

اٹھارہ سال میں پانچ ہزار کتابیں

امریکہ کے صوبۂ نبراسکا میں ایک نوجوان شوبرٹ اڈورڈ نامے پایا جاتا ہے، جس کی عمر ۱۸ سال کی ہے۔ یہ اپنی اسی قلیل عمر میں پانچ ہزار کتابوں کا نہ صرف مطالعہ بلکہ ان پر ماہرانہ بحث و تمحیص کرچکا ہے۔

اس کی قوت حافظہ کا یہ عالم ہے کہ ایکبار جس کتاب کو دیکھ لیتا ہے وہ اس کے دماغ میں محفوظ رہجاتی ہے اور نکتہ رسی کی یہ کیفیت ہے کہ جو تصنیف اسکی نگاہ سے گزر جاتی ہے اس کے متعلق ماہرانہ رائے قائم کرنے میں اس کو دیر ہی نہیں لگتی۔ علاوہ ادبیات انگریزی کے وہ علوم فلسفہ کا بھی ماہر ہے۔

جاپانی معاشرت کی بعض خصوصیات

جاپان ایک ایسا ملک ہے جہاں بہت کثرت سے مینھ برستا ہے یعنی سال میں تقریباً ۲۰۰ دن بارش کے سمجھنے چاہیئے اور اسی لئے وہاں رطوبت بہت پائی جاتی ہے یہاں تک کہ درجۂ حرارت جب بہت کافی بڑھجاتا ہے اسوقت بھی نمی دور نہیں ہوتی۔ اسی کے ساتھ سردی بھی وہاں بہت شدید ہوتی ہے اور چونکہ مکان بہت ہوادار ہوتے ہیں اس لئے ان میں ہر وقت رطوبت پائی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان حالات کے ماتحت وہاں گٹھیا وغیرہ کے امراض بکثرت پائے جانا چاہیئے، لیکن غالباً

یہ سنکر حیرت ہوگی کہ وہاں کے لوگ ان امراض سے بالکل محفوظ رہتے ہیں۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہر جاپانی امیر ہو یا غریب اسے کم از کم ایک بار روزانہ گرم پانی سے نہالینا ضروری ہے اور پانی بھی اتنا گرم جسکی حرارت ۴۵ درجہ سے کم نہ ہو۔ جاپانی جس وقت حمام سے نکلتا ہے تو اس کی جلد سرخ ہوتی ہے اور اسکے بعد گھنٹوں تک جسم کی حرارت ۳۸ درجہ تک قایم رہتی ہے۔

جاپانیوں کے بچے بھی بہت کم مرتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ ایئں ان کو خود اپنا دودھ پلاتی ہیں اور ۶، ۷ سال کی عمر تک پلاتی رہتی ہیں۔ ان کے بچوں کے لباس بھی بہت ڈھیلے ڈھالے ہوتے ہیں جس سے ان کی صحت اچھی رہتی ہے اور جسم تک ہوا آسانی سے پہونچتی ہے۔

دولت کے چوچلے

فرانس کی ایک خاتون ہیں جن کا نام لیلی لاکلوش ہے۔ یہ بہت خوبصورت ہیں بے انتہا دولتمند ہیں اور اسی کے ساتھ حد درجہ نفاست پسند۔ مختلف قسم کے ریاضتی کھیل ایجاد کرنے میں بھی ان کو خاص شہرت حاصل ہے اور لباس کے اہتمام میں تو دنیا کے اندر اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

وہ کوئی کپڑا بازار سے نہیں خریدتیں بلکہ اس کو خود طیار کراتی ہیں چنانچہ اپنے کپڑوں کے لئے انھوں نے چینی ہند میں بہت سے کارخانے صرف ریشم کے کیڑوں کی پرورش کے لئے قائم کر رکھے ہیں۔ ان کیڑوں سے ریشم حاصل کرکے ان کارخانوں کو بھیجا جاتا ہے جو انھوں نے ریشمی کپڑا طیار کرنے کے لئے فرانس میں قایم کر رکھے ہیں۔ اونی کپڑے کی فراہمی کی یہ صورت ہے کہ کالاڈینا میں ان کی لاکھوں بکریاں پائی جاتی ہیں جہاں ان کا اون نہایت احتیاط سے کاٹ کر اونی کپڑا بننے والوں کے پاس بھیجا جاتا ہے۔

حال ہی میں ایک لباس عجیب و غریب کپڑے کا ان کے جسم پر دیکھا گیا۔ دریافت کرنے پر جواب ملا کہ ڈگاسکر میں ایک خاص درخت ہے جس کی چھال سے یہ کپڑا صرف انھیں کے لئے طیار کیا جاتا ہے۔

۱۵۶۲۵۰ ٹن سگار

ممالک متحدہ امریکہ میں سالانہ جتنے سگار بنائے جاتے ہیں ان کا اندازہ بجائے شمار کے وزن سے کرنا زیادہ مناسب ہے۔ یعنی اگر ہم یوں ظاہر کریں کہ وہاں ہر سال ۱۵۶۲۵۰ ٹن یعنی تقریباً ۴۲۹۶۸۷۵ من وزن کے سگار طیار ہوتے ہیں تو زیادہ آسانی سے سمجھ میں آجائیگا۔

پھر لطف یہ ہے کہ جتنے سگار طیار ہوتے ہیں وہ سب ملک ہی کے اندر ختم ہو جاتے ہیں یعنی فی کس سالانہ اوسط ہزار سگار پڑتا ہے ــــ اتنی بڑی مقدار میں سگار طیار کرنے کے لئے وہاں سیکڑوں کارخانے موجود ہیں جہاں لاکھوں آدمی روزانہ آٹھ گھنٹے لگاتار محنت کرتے رہتے ہیں ــــ اس کی طیاری کا اوسط فی سکنڈ ۱۴۰۹۲ یا فی منٹ ۸۴۵۵۲۰ سیگار ہوتا ہے۔

جاپان کیا چاہتا ہے اور کیوں

جاپان اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر "جگہ" چاہتا ہے۔ نہ صرف چاہتا ہے بلکہ اس کے حاصل کرنے پر تلا ہوا ہے جس سے اب مغرب و مشرق کا ہر ملک واقف ہو چکا ہے ۔ جاپان کے تین مقاصد ہیں :۔

۱۔ ایشیا کی قوموں میں وہ سب سے زیادہ نمایاں شمار کی جائے

۲۔ سیاسی حیثیت سے وہ دنیا کی بڑی سی بڑی حکومت کی ہمسر قرار دیجائے۔

۳۔ جاپان والوں کے لئے غذا اور خام مواد فراہم کیا جائے، کیونکہ اب سے ۵۰ سال قبل جتنی پیداوار اہل جاپان کے لئے کافی سمجھی جاتی تھی اب وہ چوتھائی جاپان کے لئے بھی ناکافی ہے۔

گزشتہ ۶۰ سال کے اندر جاپان کی آبادی تین کرور بڑھ گئی ہے یعنی تقریبًا ساڑھے چھ کرور ہو گئی ہے۔ ان اعداد میں خالص جاپانی شامل ہیں ورنہ اگر فارموسا، کوریا اور سکھالین کو بھی شامل کر لیا جائے جو جاپان کی سلطنت میں شامل ہیں تو آبادی ۹ کرور تک پہونچ جاتی ہے ۔ پھر سوال صرف یہی نہیں کہ انکی آبادی دوچند ہو گئی ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ موجودہ تہذیب و معاشرت کے لحاظ سے ان کی اقتصادی ضروریات کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں جن کا پورا ہونا لازم ہے۔ اب اسی کے ساتھ آپ اس کے ذرایع آمدنی کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ نہ صرف اپنی غذا بلکہ اپنی مصنوعات کے لئے بھی محتاج ہے دوسرے ممالک کا کیونکہ خود اس کے ملک میں خام پیداوار اتنی نہیں ہوتی کہ اسکی ضروریات کو پورا کر سکے۔ چنانچہ یہی وہ چیز تھی جس نے اُسے منچوریا پر قابض ہونے کے لئے مجبور کیا اور اب منچوکو کی طرف مایل کیا ہے۔ منچوکو پر اسکی سیادت قایم ہونے سے اسکی دشواریاں بہت کم ہو جائیں گی کیونکہ یہاں کوئلہ اور لوہے کی معدنیں بکثرت ہیں اور زمین زرخیز ہونے کی وجہ سے غلہ کی پیداوار بکثرت ہوتی ہے، جاپانی قوم بہت زیادہ محنتی ہے اور صنعت کی طرف اس کا میلان بالکل فطری ہے، چنانچہ گزشتہ ۶۰ سال کے اندر انھوں نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس وقت وہاں ۶۰ ہزار سے زیادہ فیکٹریاں پائی جاتی ہیں جن میں ۲۰ لاکھ آدمی کام کرتے ہیں۔ ان کارخانوں میں جو مال طیار ہوتا ہے اسکی نصف سے زیادہ کھپت چین و امریکہ میں ہے اور باقی مال دوسرے ملکوں میں فروخت ہو جاتا ہے۔ جاپانیوں نے شروع سے اس بات کا خیال رکھا کہ وہ چیزیں ارزاں طیار کریں اور ارزاں بازار انکے لئے پیدا کریں چنانچہ اول اول انھوں نے اپنے ملک کے آس پاس ایسے بازار پیدا کئے اور رفتہ رفتہ ان کو بڑھانا شروع کیا یہانتک کہ اب دنیا کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے کہ جاپانی مال بہت سستا ہوتا ہے اور بازار اسی سے پٹے پڑے ہیں۔ حکومت و سلطنت کے لحاظ سے جو ترقی جاپان نے گزشتہ ۶۰ سال کے اندر کی ہے وہ بھی حیرتناک ہے۔ اول اول اسکے پاس صرف چار جزیرے تھے جنکا رقبہ ۱۴۸۰۰۰ مربع میل تھا لیکن اب منچوریا کو شامل کر کے حکومت کا رقبہ ۹۰۰۰۰۰ مربع میل تک پہونچ گیا ہے یعنی سکھالین سے آسٹریلیا تک وسیع ہو گیا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ اس میں اور کتنی وسعت ہونا ہے۔

اختراعات

"کارِ زمیں" سے ہٹ کر "آسماں پروازی" کو کسی زمانہ میں امر محال سمجھا جاتا تھا، لیکن اب علوم جدیدہ نے آسمان و زمین سب کو ایک کر کے رکھ دیا ہے یعنی اُدھر اگر آسمان میں تھگلی لگانا مشکل نہیں رہا تو دوسری طرف پاتال کی گہرائیاں بھی نگاہوں کے سامنے آ رہی ہیں۔

امریکہ کے ایک سائنس داں نے حال ہی میں ایک بندوق ایجاد کی ہے جو سمندر کی تہ میں زمین کے اندر بہت دور تک چلی جاتی ہے اور وہاں سے مادی چیزوں کو اپنے ساتھ لے آتی ہے۔ اس ایجاد سے قبل سمندر کی تہ کا زیادہ حال معلوم نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ صرف اوپر ہی کے کنکر پتھر ہاتھ آتے تھے، لیکن اس آلہ کی مدد سے زمین کے اندر تین میل تک کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

جس طرح زمین کی بیرونی جلد میں چٹانوں کی تہوں سے اُن تغیرات کا پتہ چلتا ہے جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوا ہے، اسی طرح سمندر کی تہ میں جو زمین ہے اس کے اندر بھی کیچڑ، مٹی اور چٹانوں کی تہیں پائی جاتی ہیں اور ان کے مطالعہ سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوں گی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ ایجاد علماء طبقات الارض کے لئے تحقیقات کا بالکل نیا راستہ کھولدینے والی ہے اور ہم کو اپنی "مادرِ زمین" کے متعلق بہت جلد ایسی نئی نئی باتیں معلوم ہونگی جو اس سے قبل دریافت نہ ہو سکی تھیں۔

امریکہ میں ایک شخص نے خاص قسم کا برقی آلہ ایجاد کیا ہے جو خود بخود نقب زنوں کی آمد کی اطلاع پولیس کو دیدیتا ہے۔ یہ آلہ معمولی ریڈیو سٹ کے برابر ہوتا ہے اور اس طرح نصب کیا جاتا ہے کہ نقب زنوں کو اس کا پتہ نہیں چلتا اور وہ اپنا کام کر جاتا ہے۔

یہ آلہ جس اُصول پر طیار کیا گیا ہے اس کا تعلق زیادہ تر روشنی اور بجلی سے ہے۔ جسوقت کوئی چور دروازہ کے اندر داخل ہوتا ہے تو اس کا جسم روشنی اور آلہ کے درمیان حایل ہو کر ایک خاص قسم کی برقی رو پیدا کرنیکا باعث ہو جاتا ہے اور فوراً تھانہ کی گھنٹی بجنے لگتی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ چور کسی مکان میں داخل ہو رہے ہیں۔

یہ آلے اسٹیشنوں پر بھی لگائے جارہے ہیں تاکہ اندر باہر آنے جانے والوں کو دروازہ کھولنے یا بند کرنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔ جب کوئی آدمی آتا ہے تو اس کے سایہ سے آلہ میں برقی رو پیدا ہوتی ہے جو دروازوں کو کھولتی بند کرتی رہتی ہے۔

فرانس۔۔ کے ایک شخص نے خاص قسم کا برقی قفل ایجاد کیا ہے، جس پر ٹیلی فون کے ڈایل کی طرح مختلف نمبر لگے ہوئے ہیں۔ جب یہ نمبر ٹھیک ملا دئے جاتے ہیں تو دروازہ اپنے آپ کھل جاتا ہے ورنہ بدستور بند رہتا ہے اور گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے توڑنے کی کوشش کرے تو بھی الارم بجنے لگتا ہے اور نہ صرف گھر والوں بلکہ پولیس کو بھی خبر ہو جاتی ہے۔

امریکہ کے ڈاکٹر مسٹر شنڈلر نے امراض معدہ کی تشخیص کو اپنے جدید آلہ سے جس کا نام انھوں نے "GESTROSCOPE" (معدہ بین) رکھا ہے، بہت آسان بنا دیا ہے۔ یہ چھنگلیا کے برابر ایک لچیلا ٹیوب ہے جس میں ۴۸ محدب شیشے (LENSES) لگے ہوئے ہیں۔ جس وقت بجلی اس کے اندر دوڑائی جاتی ہو تو معدہ کا ہر حصہ نظر آنے لگتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ کس جگہ کیا خرابی پائی جاتی ہے۔

آپ نے سینما میں بعض فلم SLOW MOTION کے دیکھے ہوں گے جن میں متحرک چیزوں کی حرکت نہایت آہستہ آہستہ دکھائی دیتی ہے۔ یوں اگر ہمارے سامنے گھوڑا دوڑ رہا ہے تو ہم صرف یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کے چاروں ہاتھ پاؤں نہایت جلدی جلدی آگے پیچھے پڑ رہے ہیں اور ہم کو بالکل پتہ نہیں چلتا کہ اس کے قدم کیونکر اٹھتے ہیں اور آگے پیچھے جانے میں کن کن اعصاب میں کیا کیا حرکت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ان فلموں کے ذریعہ سے ہم یہ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔

معمولی فلم جس رفتار سے طیار کئے جاتے ہیں اس میں فی سکنڈ ۲۴ تصویریں لیجاتی ہیں لیکن SLOW MOTION فلم کی تصویریں ۱۹۲ فی سکنڈ کے حساب سے لی جاتی ہیں۔ لیکن حال ہی میں ایک اور کیمرا طیار کیا گیا ہے جو ایک سکنڈ میں دو ہزار تصویریں لیگا جو پلک جھپکانے کے وقفہ کو بھی کئی منٹ کی صورت میں پیش کر سکے گا، اور اس کے ذریعہ سے معلوم ہو سکے گا کہ بندوق کے اندر سے گولی کیونکر نکلتی ہے اور نشانہ تک پہونچتے پہونچتے اس میں کیا تغیرات پیدا ہوتے ہیں۔

تاریک ستارہ

لے اُڑا سوئے فلک خضر فلک پیما مجھے
خوشۂ پروین نظر آنے لگی دنیا مجھے

ایک جھرمٹ تھا ستاروں کا نظر کے سامنے
یا پڑے تھے آئینے آئینہ گر کے سامنے

ہر ستارے کو یہ دعوے تھا کہ روشن تر ہوں میں
قطب ہوں اقصائے عالم کے لئے رہبر ہوں میں

مجھ سے رہبر نے کہا اے مشتِ خاکِ بے ثبات
دیکھ بس یہ ہے تری دنیا کی ساری کائنات

روشنی سب نور آزادی کی ارزانی سے ہے
ان ستاروں میں چمک قوموں کی پیشانی سے ہے
گوشہ گوشہ دل جلوں کے نور سے معمور ہے
ہر چراغِ بزمِ آزادی چراغِ طور ہے،

ان ستاروں میں مگر اک خطۂ تاریک تھا،
دوسرے تھے دور مجھ سے یہ ذرا نزدیک تھا

یہ زمیں کیا تھی سراسر خطۂ ظلمات تھی
یا ستاروں کی بھری محفل پہ چھائی رات تھی

اسکو دکھلا کر کہا یہ خضر نے اے نوجواں
دیکھ یہ تیرا وطن ہے خطۂ ہندوستاں

مدتوں سے ظلمت و نکبت کا ڈیرا ہے یہاں
ظلمتِ داغِ غلامی سے اندھیرا ہے یہاں

دشمنِ انسانیت قوموں کا مسکن ہے یہی
جذبۂ احساس آزادی کا مدفن ہے یہی

ننگِ عالم ہے یہ خطہ اس قدر پھیلا ہوا،
دامنِ گیتی اسی کی گرد سے میلا ہوا

پانی پانی ہو رہا ہے کیوں وفورِ شرم سے
صاف کر داغِ غلامی اپنے خونِ گرم سے

قیصر امراوتی

غزل

مری حسرتوں کا نہ ذکر کر کہ بہائے عشق حرام ہے
صلۂ وفا سے غرض نہیں مجھے اپنے کام سے کام ہے

مری زیست کا ہے گماں تجھے تو مری نمود کو ڈھونڈ لے
میں ثبوتِ حاصلِ عشق ہوں مجھے اپنی دید حرام ہے

ادھر آرزو کی بنا پڑی کہ نظامِ دہر بدل گیا
نہ وہ آسماں ہے نہ وہ زمیں نہ وہ صبح ہے نہ وہ شام ہے

تو نظر نظر میں ہے جلوہ گر ہے نفس نفس میں بھی تو مگر
مری شرحِ آرزو مختصر مرا شوق نیم تمام ہے

مجھے اپنی نسبتِ بندگی سے مجالِ حرف زدن نہیں
ترے عفو اور مرے گناہ کا ورنہ ایک مقام ہے

تمکین سرمست

غزل

اب اس کو کیا کروں میں جس قدر بھلاتا ہوں
اُسی قدر وہ مجھے یاد آئے جاتے ہیں

ستم نہیں ہے ارے ناداں کرم ہے عینِ کرم
کہ یاد آنے ہی والے بھلائے جاتے ہیں

کسی کی یاد بھی اب میرے بس کی بات نہیں
کہ جب وہ چاہتے ہیں یاد آئے جاتے ہیں

وہ میرا صبر، کہ آیا ہے اور نہ آئے گا
یہ میرے ہوش، کہ بیٹھے بٹھائے جاتے ہیں

ہم اور زندگی، اے تیری شان کے قرباں
مٹائے جانے کو کیا کیا بنائے جاتے ہیں

حجابِ حُسن بھی کیا طرفہ بسر ہے تمکیں
مرے خیال مجھی سے چھپائے جاتے ہیں

تمکین سرمست

غزل

جانِ حزیں کو نذرِ محبت نہ کر سکے
اتنی بھی پاسداریِ ہمت نہ کر سکے

شوقِ فزوں طلب نے کیا عمر بھر ذلیل
ہم چاہتے تھے اور قناعت نہ کر سکے

چھوٹے جو ہم قفس سے تو فطرت بدل گئی
اُڑنے کی اس کے بعد بھی ہمت نہ کر سکے

جلتے ہم آپ اور جلاتے جگر کا داغ
کچھ اہتمام اے شبِ فرقت نہ کر سکے

قربان اس بناؤ کے صدقے بگاڑ کے
وہ چاہتے تھے اور عداوت نہ کر سکے

اُس آستاں کے سجدے میں آنکھیں ہوئی ہیں بند
اظہار ذوق و شوقِ عبادت نہ کر سکے

پردہ بنا ہوا تھا دلِ سادگی سرشت
کچھ امتیاز جور و عنایت نہ کر سکے

کیفی (چریاکوٹی)

غزل

ساقی کی نوازش سے گردش میں ہے پیمانہ
ہاں! لغزشِ مستانہ، اک سجدۂ شکرانہ

مقصودِ محبت کا کعبہ ہے نہ بتخانہ
دھوکے ہیں نہ آجانا، اے ہمتِ مردانہ

تم ہی نے پکارا تھا اک دن مجھے دیوانہ
تم ہی نے سنایا تھا، مجھ کو مرا افسانہ

کچھ عکس ہیں ساقی کی مخمور نگاہوں کے
شیشہ ہے نہ بادہ ہے، مینا ہے، نہ پیمانہ

اک روز کرم کرنا، فرصت ہو تو سن لینا
اک درد بھرا قصہ، یعنی مرا افسانہ

ماہر القادری

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دُنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔

قیمت تین روپیہ (سعہ) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔

مجموعہ استفسار و جواب دو جلد

ان دونوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۲۹ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سائکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایکروپیہ کم۔

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲؍)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳؍) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲۔ مادئین کا مذہب۔

۳۔ حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴؍) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حُسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰؍)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲؍) کم

فراست الید

مؤلفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴؍) کم

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲؍)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳؍) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کی تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اُردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عگ)

علاوہ محصول

SHAHI

REG.

BEST TONIC FOR GENERAL DEBILITY

SPECIFIC FOR :-
anaemia,
asthma,
tuberculosis,
&
female troubles,

جملہ اقسام کے یونانی مرکبات
صحیح اور پورے اوزان
سے تیار شدہ حاصل کرنا
چاہتے ہیں تو

فہرست دواخانہ

مفت طلب فرمادیں

دماغی اور اعصابی کمزوری

کے لئے "شاہی" لاجواب اور دماغی کام کرنے والے اصحاب کے لئے بے نظیر تحفہ ہے۔
خون کی کمی (انیمیا) کو دفع کرنے اور خون کی افزایش کے لئے "شاہی" کو دنیا کی تمام ادویات پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ افزائش خون کے تمام اجزا اس میں موجود ہیں۔
دمہ و کھانسی اور سل و دق کے لئے نہایت مفید ہے۔
عورتوں کے جملہ امراض ہسٹریا (اختناق الرحم) لیوکوریا (سیلان الرحم)، عام جسمانی کمزوری کے دفع کرنے میں "شاہی" بیحد مفید ثابت ہوئی ہے۔

مزید معلومات کے لئے مفت رنگین رسالہ مفت طلب کریں

طبی دواخانہ یونانی

چوک بازار اندر شہر
تار کا پتہ "شاہی" اندور

۲۶ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳
ٹیلیفون نمبر ۲۶۹۸۳